نیکی کر تھانے جا

ابراہیم جلیس

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

LARGE PRINT BOOKS SERIES
URDU

NEKI KAR THANE JA

(Stories : Humour)
by
Ibrahim Jalees

ابراہیم جلیس

نیکی کر تھانے جا

فہرست

نیکی کر تھانے جا

پرانے زمانے کی "ہر نصیحت" موجودہ زمانے میں "نصیحت"
باعث ہوتی ہے۔ یا پھر پرانے زمانے کے بہترین اخلاقی اصولوں پر
اترنے والا انسان موجودہ زمانے میں ایسا ہی ناموزوں یعنی مس
(misfit) ہے جیسا کہ کسی ہیر کٹنگ سیلون میں کوئی داڑھی
یا صفاچٹ والا گنجا آدمی فالتو یا غیر ضروری ہوتا ہے۔

ہم کوئی پُرانے زمانے کے آدمی نہیں ہیں۔ لیکن بچپن سے
ہماری تعلیم و تربیت کچھ ایسی ہوئی ہے کہ ہمارے والدین اور اساتذہ
نے ہماری زندگی کو گویا پرانے زمانے کے بہترین اخلاقی اصولوں
کے سانچے میں ڈھال کر نکالا ہے۔

ہر چند کہ ہر پند پر پابند ہونا بہت مشکل ہے۔ تاہم چند پند
سودمند پر ہم ایسی سختی سے پابند ہیں کہ ایک بار جیل میں بھی بند
کر دیئے گئے۔

جن چند سودمند پر ہم پابند ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

۱۔ ہمیشہ سچ بولو۔

کیسی ہی مصیبت کیوں نہ آئے جھوٹ کبھی نہ بولو۔
نمرود کی آگ میں ابراہیم کا ساتھ ہمیشہ موجود رہے۔

۲۔ ہر مظلوم کی مدد کرو۔

۳۔ کسی غیر عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھو۔

۴۔ مہمان پر اپنے گھر کے دروازے کھول دو۔

۵۔ پڑوسی سے تعلقات اچھے رکھو۔

اب دیکھئے گا کہ ان چند پند سود پر پابند رہنے سے ہم پر کیا گزری؟

اب سے کئی برس پہلے تعلیم ختم کرنے کے بعد ہم پہلی بار ایک سرکاری محکمے میں خزانچی کے عہدے پر مامور ہوئے۔ اور ایک شام جب کہ ہماری جیب میں تین ہزار سرکاری روپیہ تھا اور ہم گھر لوٹ رہے تھے کہ راستے میں چند ڈاکوؤں نے ہمیں گھیر لیا اور ہماری ہاتھ کی گھڑی، فاؤنٹین پین اور ہماری جیب کے دس بارہ روپے لوٹ لئے۔ لیکن سرکاری تین ہزار روپیہ ان کے ہاتھ نہ آسکا۔ وہ ڈاکو جانے لگے اور جاتے جاتے ایک ڈاکو کو کیا خیال آیا کہ وہ پلٹا اور بولا۔

''سچ سچ بتاؤ۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ تو تمہارے پاس اور کچھ نہیں ہے؟''

ہمیں یہ سختی سے ہدایت تھی کہ کیسی ہی مصیبت کیوں نہ آئے جھوٹ نہ بولو اور یہاں تو ڈاکو کا بھی اصرار یہی تھا کہ سچ بتاؤ۔

چنانچہ ہم نے سچ بتا دیا کہ ہماری اندر کی جیب میں سرکاری تین ہزار روپیہ ہے۔

ڈاکو نے بڑے غصّہ سے کہا۔

''اچھا۔۔۔! تو وہ تین ہزار روپیہ ہمارے حوالے کیوں نہ کیا۔۔۔؟ چلو نکالو وہ روپیہ جلدی سے۔''

ہم نے روپیہ نکال کر ڈاکو کے حوالے کرتے ہوئے اسے حضرت عبدالقادر جیلانیؒ اور ڈاکو کا وہ واقعہ سُنایا کہ کس طرح سچ بولنے پر ڈاکو حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے قدموں میں گر پڑا اور ڈاکہ زنی سے ہمیشہ کے لئے توبہ کرلی۔

یہ واقعہ سُن کر ڈاکو قہقہہ مار کر ہنس پڑا اور بولا۔

میاں تم توبہ کرو۔ میں کیوں توبہ کرنے چلا۔۔۔ میں تو ڈاکہ مارنے چلا تھا نہ کہ توبہ کرنے چلا تھا''

دوسرے دن یہ واقعہ سچ سچ ہم نے اپنے افسرِ اعلیٰ کو بتایا تو اسے ہم پر ترس آیا۔ اور اس نے ہمیں ہدایت کی کہ ہم یہ جھوٹ بولیں کہ۔

''یہ رقم نائب خزانچی نے غبن کی ہے۔''

افسر اعلیٰ کی نائب خزانچی سے دشمنی تھی اور وہ اسے گرفتار کروانا چاہتا تھا۔ لیکن ہم کسی بے گناہ آدمی کو کیسے پکڑوا سکتے تھے۔

چنانچہ ہم نے محکمہ کے اعلیٰ افسروں سے لے کر پولیس تک ہر جگہ سچ ہی کہا۔ اور نتیجہ یہ نکلا کہ ہمیں اپنی والدہ کا سارا زیور فروخت کر کے تین ہزار روپیہ سرکاری خزانے میں جمع کرانا پڑا۔ اور ہمیں نہ صرف نوکری سے برطرف کر دیا گیا بلکہ سارے ملک میں ''ممنوع الملازمت'' قرار دیا گیا۔

سچ بول کر سرکاری تین ہزار روپیہ، والدہ کا سارا زیور اور اچھی سرکاری نوکری ہمیشہ کے لئے گنوا کر ایک رات ہم چھّر مارتے جاگ رہے تھے کہ پڑوس کے گھر سے اچانک ایک عورت کی دلدوز فلک شگاف چیخیں سنائی دیں۔

غالباً اس عورت کا خاوند اس مظلوم عورت کو دھڑا دھڑ پیٹ رہا تھا۔ ہم سے اس مظلوم عورت کی مظلومیت برداشت نہ ہو سکی۔ اس کے گھر کے سارے دروازے بند تھے۔ اس لئے صحن کی دیوار پھاند کر ہم اس کے گھر میں داخل ہوئے۔ ظالم شوہر کی سرکوبی کی اور مظلوم بیوی کو اس کے ظلم سے نجات دلا دی۔ لیکن نہ جانے پولیس کہاں سے آ گئی۔ اور تھانے دار نے بڑے طنزیہ اور معنی خیز انداز میں ہماری صفائی کے جواب میں کہا۔

''ہوں۔۔۔خوب سمجھتا ہوں۔ ہماری دنیا میں یہی ایک مظلوم عورت رہ گئی تھی کہ تم اس کی مدد کرو۔اس ''مدد'' کا مطلب بھی میں خوب اچھی طرح جانتا ہوں۔''

پتہ نہیں ہماری کونسی نیکی آڑے آگئی کہ تھانے دار نے ہم سے صرف یہ توبہ کروا کر ہمیں چھوڑ دیا کہ ہم آئندہ کسی مظلوم اور بالخصوص مظلوم عورت کی کبھی کوئی مدد نہیں کریں گے۔ہمیں اس واقعہ کے علاوہ سب سے زیادہ دُکھ تو اس بات کا تھا کہ وہ مظلوم عورت الٹا ہمارے خلاف ہو گئی تھی اور کہہ رہی تھی کہ۔

''میرا شوہر مجھے جتنا چاہے مارے، چاہے جان سے مار دے، تم کون ہو بھلا آدھی رات کو میرے گھر میں کودنے والے...؟''

اس سانحے کے چندروز بعد ہم ایک دن محلّے کی گلی میں سے گزر رہے تھے کہ ایک غنڈے نے محلّے کی راہ چلتی لڑکی کو چھیڑا۔اس وقت گلی میں بلکہ محلے میں ہمارے سوائے کوئی مرد نہ تھا۔سارے مرد ہماری طرح بے روزگار اور ممنوع الملازمت نہ تھے۔اپنے اپنے کاموں پر گئے ہوئے تھے۔غنڈے نے ہمارے سامنے اس لڑکی کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ وہ لڑکی بھی چیخ رہی تھی اور محلے کے ہر گھر کی کھڑکیوں اور دروازوں میں کھڑی ہوئی پردہ دار بیویاں بھی چیخ رہی تھیں۔

''بچاؤ....بچاؤ....غنڈے سے لڑکی کو بچاؤ.....''

بیبیاں ہم سے کہنے لگیں۔

''کیسے مرد ہو تم....تمہارے سامنے ایک غنڈہ اس لڑکی کو چھیڑ رہا ہے اور تم خاموش ہو.....؟''

ہم نے جواب دیا۔

''ہم غیر عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتے۔''

بیبیاں لعن طعن کرنے لگیں۔

آدھی رات کو دوسری عورتوں کے گھروں میں تو کود سکتے ہو۔ اور سڑک پر دن دہاڑے ایک مظلوم لڑکی کو غنڈے کے پنجے سے نہیں چھڑا سکتے۔''

ظاہر ہے کہ ہماری غیرت جاگ پڑی۔ آنکھوں میں خون اتر آیا اور ہم دانت کچکچا کر اور مٹھیاں بھینچ کر باہر بالکل گونگے ٹارزن کی طرح غنڈے کی طرف بڑھے۔ غنڈے نے ہمیں اس طرف بڑھتے دیکھا تو لڑکی کو چھوڑ دور ہی سے سمجھانے کے انداز میں بولا۔

''میری طرف بڑھنے سے پہلے اچھی طرح انجام کو سوچ لو۔ فلانے لیڈر کا غنڈہ ہوں۔''

ہم نے غنڈے اور لیڈر دونوں کو بے نقط سُنائیں، اور اس غنڈے کو دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر زمین پر ایسی پٹخنی دی کہ غنڈے کی

ناک کے دونوں نتھنوں سے دو دو بھنڈیاں ثابت وسالم باہر نکل آئیں۔
کمبخت بھنڈی اور وہ بھی بغیر بھنڈی چبائے کھا کر گھر سے نکلا تھا!

اس موقع سے فائدہ اٹھا کر لڑکی چمپت ہو گئی۔ البتہ راہ گیر اکٹھے ہو گئے۔ ہم اور شیر ہو گئے اور غنڈے کو مار مار کر بکری بنا دیا۔

اتنے میں پولیس آ گئی۔ پولیس ہمیں اور اس غنڈے کو تھانے لے گئی۔ تھانیدار شریف آدمی بھی تھا۔ وہ غنڈے سے پہلے سے واقف تھا۔ اس لئے وہ غنڈے کے خلاف کوئی کاروائی کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے اس واقعے کے چشم دید گواہوں کو پیش کرنے کے لئے کہا۔

تھانے تک ہمارے ساتھ کوئی چالیس پچاس آدمی چلے آئے تھے۔ لیکن جیسے ہی تھانے دار نے گواہوں کو پیش کرنے کے لئے کہا۔ سارے گواہ پس و پیش کرنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے چالیس پچاس چشم دید گواہ تھانے سے باہر تھے۔ بلکہ سڑک پر اپنے اپنے گھروں کو سچ مچ بھاگے جا رہے تھے۔

اتنے میں ایک شاہانہ موٹر کار تھانے کے احاطے میں داخل ہوئی۔ اس میں سے وہی 'فلانا لیڈر' اترا جس کی دھمکی غنڈے نے دی تھی۔ فلانے لیڈر نے بڑے رعب سے تھانیدار سے کہا۔

"آپ نہیں جانتے تھے کہ یہ میرا آدمی ہے اور اس نے میرے الیکشن میں سب سے زیادہ کام کیا ہے۔"

تھانیدار فرض شناس افسر تھا۔ بولا۔

"مصیبت تو یہ ہے جناب کہ سارے غنڈے کسی نہ کسی لیڈر کے الیکشن ورکر رہ چکے ہیں اور ہر غنڈے نے اپنے لیڈر کی آڑ لے کر وہ غنڈہ گردی مچائی ہے کہ اندیشہ ہے کہیں عوام کا پولیس پر سے اعتماد بالکل ہی نہ اٹھ جائے۔"

فلانا لیڈر ناراض سا ہو گیا اور بولا۔

"آپ جانتے ہیں میں کہاں تک جا سکتا ہوں؟"

"ہوں؟"

تھانے دار بولا۔

"جی ہاں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ لاہور اور پنڈی تک جا سکتے ہیں۔ لیکن میں اپنے فرائض کی حدود سے آگے نہیں جا سکتا۔ خواہ آپ میرا تبادلہ کرا دیں یا برطرف کرا دیں۔"

اس گفتگو کے بعد لیڈر تھانے سے باہر اور اس کا غنڈہ حوالات کے اندر تھا۔

ہم بڑے خوش خوش گھر لوٹے کہ واہ واہ ہم نے ایک مظلوم (لڑکی) کی کیسی کامیاب مدد کی ہے!

لیکن.... لیکن شام کو ہم نے دیکھا کہ وہی غنڈہ بڑی شان سے اکڑتا پھر رہا ہے۔ اور تھوڑی دیر بعد ہم دوبارہ تھانے پر بلوائے

گئے تھے۔ تھانے دار کوئی نیا آدمی تھا۔ وہ تھانے دار جس نے مظلوم کی مدد کی تھی وہ جانے کہاں تھا؟

صرف تھانے دار ہی نہیں بدلا تھا۔ بلکہ وہ واقعہ بھی سارا بدل گیا تھا۔ یعنی۔

لڑکی کو اس غنڈے نے نہیں بلکہ ہم نے چھیڑا تھا۔

حیرت کی بات تو یہ تھی کہ اب گواہ بھی موجود تھے اور ایسے گواہ موجود تھے جو واقعے کے وقت موجود نہ تھے۔

چند نوجوان لڑکیاں بھی ہمارے سامنے پیش کی گئیں۔ کہ

"پہچانو ان میں سے وہ کون سی لڑکی ہے۔ جس کو چھیڑا گیا"

ہم نے جواب دیا۔

"ہم غیر عورت کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتے۔ اس لئے ہم نے اُس لڑکی کو نہیں دیکھا ہے جسے چھیڑا گیا۔ اور نہ ہم ان لڑکیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھیں گے۔"

یہ سُن کر نئے تھانیدار کو غصّہ آ گیا، ظاہر ہے کہ دنیا میں سب انسان ایک جیسے نہیں ہوتے اسی طرح سارے تھانے دار بھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔

لیکن ہم بھی کوئی "لاوارث" آدمی نہیں تھے اس لئے ہمیں صرف اس تنبیہہ کے ساتھ چھوڑ دیا گیا کہ

”آئندہ سے راہ چلتی لڑکیوں کو چھیڑا نہ کرو۔“

ہم بڑے رنجیدہ تھانے سے باہر نکلے کہ بھئی واہ، نیکی کا یہ کیسا اجر ہے کہ:

نیکی کر اور تھانے جا۔

سچ بولنے کا تلخ تجربہ تو پہلے ہی تھا اب مظلوم کی مدد اور غیر عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنے کی سزا بھی بھگت لی تھی۔

ہم بالکل مایوس ہو چکے کہ ایک بزرگ آ دھمکے۔ اُنہوں نے جب سارا ماجرا سُنا اور ہمیں مایوس دیکھا تو بڑے غصّے سے ڈانٹا۔

”تمہیں شرم نہیں آتی کہ مسلمان ماں باپ کے بیٹے ہو کر کافر ہو گئے ہو؟“

کافر؟ ہم نے بھونچکے ہو کر پوچھا۔

”کون مردود کافر ہوا ہے؟“

بزرگ بولے۔

”جانتے نہیں ہو کہ مایوسی کفر ہے۔“

ہم نے از سرِ نو کلمہ طیبہ پڑھا۔ اور از سرِ نو عزم کیا کہ ہمت نہیں ہاریں گے۔ اور خواہ ہم پر کیسی ہی مصیبتیں پڑیں ہم ان چند پند سودمند پر پابند اور کاربند رہیں گے، جن سے انسان آدمی کے روپ میں فرشتہ بن جاتا ہے۔

اتنے میں کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔کوئی اجنبی تھا اور کہہ رہا تھا۔
''پردیسی ہوں آپ کے گھر مہمان رہنا چاہتا ہوں۔''
معاً ہمیں یہ نصیحت یاد آگئی کہ مہمان پر اپنے گھر کے دروازے کھولدو۔
مہمان بالکل اجنبی تھا۔
لیکن اس کے بالکل اجنبی ہونے کے باوجود ہم نے اپنے گھر کے دروازے اس لئے اس پر کھول دیئے کہ ہمیں بچپن ہی سے یہ سکھایا گیا تھا کہ:
''مہمان کو فرستادۂ خدا سمجھو،اس کی خاطر و مدارات میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھو۔''
چنانچہ ہم مہمان کو دیوان خانے میں آرام سے بٹھا کر اندر زنانخانے میں گئے۔ بیوی مہمان کی آمد سُن کر پریشان ہوگئی۔ کیوں کہ ہم نے مہمان کے لئے دستر خوان بچھانے کی ہدایت کی تھی اور اس وقت رات کے کھانے کا وقت گزر چکا تھا۔تھوڑا سا سالن اور صرف دو نان باقی رہ گئے تھے۔ حالانکہ اس وقت ہم نے خود کھانا نہیں کھایا تھا۔
ہم نے بیوی سے کہا۔
''ہماری فکر نہ کرو۔مہمان کے لئے تم مرغی ذبح کردو۔''

ہماری بیوی نے مرغی اس لئے پالی تھی کہ بازار میں انڈے مہنگے فروخت ہوتے ہیں اور ڈاکٹر نے ہمیں انڈے کھانے کی ہدایت کی تھی۔ چنانچہ بیوی نے مرغی پالی کہ میاں انڈے کھائے۔

بیوی مرغی حلال کرنے پر تیار نہ ہوئی تو ہمیں بڑا دُکھ ہوا کہ ایک ہم بھی مہمان نواز ہیں اور ایک حضرت حاتم طائی مہمان نواز تھے۔ حاتم طائی نے مہمان کے لئے اپنا عزیز گھوڑا ذبح کر دیا تھا۔ اور بیوی ہمارے مہمان کے لئے یہ "غلیظ مرغی" ذبح کرنے کے لئے تیار نہیں!

ہم نے بیوی کو تاریخی کہانیوں کے حوالے دے کر قائل کرنے کی کوشش کی کہ مہمان کوئی آسمانی فرشتہ یا بھیس بدلا ہوا حاکم ضرور ہوگا۔ اور اس میزبانی کے بدلے شاید ہمیں مالا مال کر کے ہماری قسمت بدل دے۔

بیوی کو ہمارا یہی مشورہ تھا کہ اس مہمان کو بھی وہ "پرائز بونڈ" یا "قومی صنعتی نمائش کا لکی ٹکٹ" سمجھے۔

لیکن بیوی غصّے میں تھی اور اپنی بات پر اڑی رہی کہ خود بھوکے رہو اور اپنے حصے کا کھانا مہمان کو کھلا دو۔"

بیوی کی اس حرکت پر ہمیں زیادہ دُکھ اس لئے نہیں ہوا کہ ہر نیک آدمی کو بدمزاج بیوی ملتی ہے۔ سقراط جیسے نیک آدمی سے بھی

یہی مشہور ہے کہ ''بی حاتم طائی'' نے میزبانی کے معاملے میں ''میاں حاتم طائی'' سے بھی تعاون نہیں کیا۔

اس لئے ہم نے بیوی سے تو کچھ نہ کہا البتہ دیوان خانے میں دستر خوان بچھا کر مہمان کو بٹھا دیا اور اس کے سامنے ہی اپنے حصّے کا بچا ہوا سالن اور دو نان رکھ دیئے۔ پھر لائٹ آف کر کے ہم خود بھی دستر خوان پر بیٹھ گئے۔ مہمان اندھیرے میں دستر خوان پر پل پڑا اور ہم خالی خولی منہ سے ''چپ چپ'' کی آوازیں نکالتے رہے کہ مہمان یہ سمجھے کہ ہم بھی اس کے ساتھ کھانا کھا رہے ہیں۔

لیکن تھوڑی ہی دیر بعد مہمان نے بڑے غصّے سے ڈانٹ کر کہا۔

''ارے بھائی لائٹ تو جلا دو۔ کھانے کے لئے کچھ نظر نہیں آ رہا۔''

ہم نے لائٹ جلائی تو دیکھا کہ مہمان اندھیرے میں سالن اور نان سب چٹ کر گیا ہے اور اُجالے میں ''ہل من مزید'' کے نعرے لگا رہا ہے۔

ہمارے آگے کوئی پلیٹ نہیں تھی۔ یہ دیکھ کر مہمان بڑے طنز سے بولا۔

''یار عجیب میزبان ہو تم! مہمان کو آدھا پیٹ کھلایا اور خود

پلیٹ تک نگل گئے!"

ہم نے معذرت کی۔ نصف شبی کا عذر کیا تو مہمان بڑی مشکل سے "نصف شکمی" پر راضی ہوا۔ وہ تو پانی پی کر سو رہا، اور ہم خون کے گھونٹ پی کر جاگتے رہے۔

مہمان کے بارے میں مشہور ہے کہ "تین روز تک مہمان عزیز از جان۔ تین روز بعد مہمان۔ بلائے بے درماں۔

تین روز تو کیا مہینہ گزر گیا..... بلائے ہے درماں" تو اب پیچھا نہیں چھوڑتا تھا۔

اوروں کے لئے تو یہ لطیفہ ہوگا۔ ہمارے لئے واقعہ ہے کہ ایک دن آ کر ہم نے مہمان سے پوچھا۔

"کیا آپ کو اپنے بیوی بچے یاد نہیں آتے؟"

مہمان یعنی بلائے جان نے ایک آہ بھر کر کہا۔

"اجی کچھ نہ پوچھیے۔ بہت یاد آتے ہیں۔ میں نے آج ہی خط لکھا ہے یہاں بلوائے لیتا ہوں۔"

یہ بات سُن کر ہمارے ہاتھ جیسے پھول گئے۔ لیکن عین اسی وقت ہماری طرح سادہ لوح ہمارا لڑکا باہر سے آیا اور مہمان کے سامنے ہم سے کہنے لگا۔

"ابّا...... محلّے کے سارے دوکان دار کہہ رہے ہیں کہ کوئی

خفیہ پولیس کا سپاہی مہمان صاحب کے بارے میں چپکے چپکے پوچھ گچھ کر رہا ہے۔"

یہ سُن کر مہمان بھی ایک دم پریشان ہو گیا۔لیکن اپنے آپ پر فوراً قابو پا کر تھوڑی دیر بعد وہ حسبِ معمول اپنے کاروبار پر گھر سے باہر چلا گیا۔

اس رات مہمان گھر نہ آیا۔تو ہم نے سوچا کہ صبح خفیہ پولیس کے اس سپاہی کا شکریہ ادا کریں جس نے ہمیں اس بن بلائے جان مہمان سے نجات دلا دی تھی۔

لیکن خفیہ پولیس کے اس سپاہی نے ہمیں اس کے دفتر تک جانے کی زحمت نہ دی۔وہ خود ہی علی الصبح ہمارے گھر پہنچ گیا۔ہم اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتے تھا اور وہ ہمیں ڈانٹ رہا تھا۔

"سیدھے سیدھے میرے سوالات کے جوابات ادا کرو۔"

سوالات کے جوابات ادا کرنے کے بعد پتہ چلا کہ مہمان صاحب سونا، چرس اور کرنسی اسمگل کرنے کے علاوہ جعلی پاسپورٹ کا بھی کاروبار کیا کرتے تھے۔اور جعلی پاسپورٹ پر رات خود بھی لندن روانہ ہو گئے۔

خدا بھلا کرے ہماری نیکیوں کا۔جو ہمارے ہر "آڑے وقت" میں "آڑے آجاتی ہیں۔

بڑی مشکل سے خفیہ پولیس سے جان چھوٹی۔ لیکن ہمیں خفیہ پولیس سے جان چھوٹنے کی اتنی خوشی نہیں تھی جتنی کہ ہم اس بلائے بے درماں قہر بر جان اور بے ایمان سے جان چھوٹنے پر شاداں و فرحاں تھے۔

پولیس عوام کی جان و مال اور عزّت اور آبرو کی محافظ ہوتی ہے پولیس عوام کی دوست ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں ابھی تک کسی گھر پر پولیس کا آنا بُرا سمجھا جاتا ہے اور جس گھر پر پولیس آتی ہے اس گھر کے رہنے والوں کو اہلِ محلّہ مشکوک نظروں سے دیکھتے ہیں۔

چنانچہ ہم نے نئے محلّے میں نیا مکان کرائے پر لیا۔

اللہ کا احسان اور مقام شکر و امتنان کہ نیا محلّہ اور نیا مکان ہمیں بہت پسند آئے۔

صبح سویرے ہمیں پند یاد آئی کہ:

''پڑوسیوں سے اچھے تعلّقات رکھو''

چنانچہ اس پر فوراً کاربند ہونے کے لئے ہم پہلے دائیں پڑوسی کے بند درواز پر پہنچے، دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے بھاری بھرکم دایاں پڑوسی آدھے چہرے پر صابن کے جھاگ اور ہاتھ میں شیونگ برش لئے باہر نکلا اور بڑے غصّے سے بولا۔

''کون ہو تم....؟''

ہم نے بصد خوش اخلاقی مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں آپ کا نیا پڑوسی ہوں....“

دائیں پڑوسی نے پوچھا۔

”پھر....؟“

اس غیر متوقع طرزِ عمل سے ہم اچانک بوکھلا گئے اور بوکھلاہٹ میں ہماری زبان سے نکلا۔ ”پھر“ دایاں پڑوسی دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔

”پھر کیا....؟ تمہارا دماغ پھر گیا ہے۔“

اس ”شماتت ہمسایہ“ سے ہمیں بڑا دُکھ ہوا۔ ہم نے بیوی سے ہمسایہ کی شکایت کی تو بیوی بولی۔

”پڑوسی نے سچ ہی کہا ہے کہ تمہارا دماغ پھر گیا ہے بھلا اتنے سویرے پڑوسی کے گھر جانے کی کیا تُک تھی۔“

بیوی ناقص العقل ہوتی ہے۔ اس لئے ہم نے چپ چاپ ناشتہ کیا۔ اور ناشتہ کے دوران بیوی ہمارے زخموں پر نمک اور انڈوں پر کالی مرچ چھڑکتی رہی۔

ناشتے سے فارغ ہو کر ہم بائیں پڑوسی کے گھر پہنچے۔ دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے ایک نہایت دبلا پتلا چمرخ اور معنک یعنی ”عینک چی“ آدمی باہر نکلا تو ہم نے خندہ پیشانی اور خندہ لبی کے ساتھ کہا۔

”میں آپ کا نیا پڑوسی ہوں۔“

بائیں پڑوسی نے بھی دائیں پڑوسی کی طرح پوچھا۔

”پھر؟“

اب کی بار ہم نے سنبھل کر کہا۔

”پھر کیا.....ہم آپ سے متعارف ہونے آئے ہیں۔ کیونکہ ہم اپنے پڑوسیوں سے اچھے خوشگوار اور دوستانہ تعلقات قائم کرنا چاہتے ہیں۔“

بالکل غیر متوقع طور پر بائیں پڑوسی نے نہایت روکھے پن سے جواب دیا۔

”مگر میں تو اپنے پڑوسیوں سے اچھے خوشگوار اور دوستانہ تعلقات نہیں رکھنا چاہتا۔“

ہمیں بڑی حیرت ہوئی اور ہم نے پوچھا۔

”وجہ...؟“

بائیں پڑوسی نے وجہ بتائی۔

”اس لئے کہ میں حال ہی میں ہندوستان سے آیا ہوں۔ ابھی تک میں ”انڈین نیشنل“ ہوں۔ اور بہ حیثیت ایک ہندوستانی میں اپنے پڑوسیوں سے اچھے خوشگوار اور دوستانہ تعلقات نہیں رکھنا چاہتا۔“

یہ کہہ کر اس ہندوستانی نے مزید گفتگو کے دروازوں کے علاوہ اپنے گھر کا دروازہ بھی ہم پر بند کر دیا۔

پڑوسی کا دروازہ ہی بند ہو تو پڑوسی سے اچھے تعلقات کی پند پر کاربند ہونے کا سوال ہی کیا؟

لیکن ہم مایوس نہیں ہوئے۔ دوپہر کے کھانے کا وقت آیا تو ہمیں ایک اور پند یاد آئی کہ:

''دستر خوان پر بیٹھنے سے پہلے یہ پتہ کر لو کہ تمہارا کوئی پڑوسی بھوکا تو نہیں بیٹھا ہے۔''

چنانچہ ہم پھر دائیں پڑوسی کے گھر پہنچے۔ دروازہ کھٹکھٹایا تو پتہ چلا کہ دایاں پڑوسی تو دفتر گیا ہے۔ اس کی بیوی گھر میں موجود ہے۔ ہم نے آواز دے کر پوچھا۔

''آپ کے گھر کوئی بھوکا تو نہیں ہے۔''

یہ سُنا ہی تھا کہ دائیں پڑوسَن آگ بگولہ ہو گئی اور ایک دم گالیاں بکنے لگی۔

''موئے تو بھوکا ہو گا۔ تیرے گھر والے بھوکے ہوں گے۔ میرے گھر میں خدا نہ کرے کوئی بھوکا ہو۔''

اب ہم عورت ذات سے کیا الجھتے۔ جب کہ ہمارا نصب العین بھی پڑوسیوں سے اچھے تعلقات رکھنا تھا۔ لہٰذا ہم اکیلے ہی

کوفت اور روٹی کھا کر نہایت رنجیدہ بستر پر لیٹ گئے اور سو گئے۔

جب آنکھ کھلی تو پتہ چلا کہ دایاں پڑوسی پولیس لے کر باہر آیا۔

عجیب بات ہے۔ جب بھی ہم کوئی اچھا اور نیک کام کرتے ہیں پولیس فوراً ہمیں گھیر لیتی ہے۔

ملک میں بُرے اور جرائم پیشہ آدمی غالباً اسی لئے دندناتے پھرتے ہیں کہ پولیس کو نیک اور شریف آدمیوں ہی سے فرصت نہیں ملتی۔

یہ بھی عجب حُسنِ اتفاق ہے کہ جب بھی پولیس ہماری طرف بڑھتی ہے ہماری کوئی نہ کوئی نیکی ہمارے اور پولیس کے درمیان آڑے آجاتی ہے۔ چنانچہ پولیس ہمیں تھانے کے بجائے پاگل خانے لے گئی۔

پاگل خانے کے سمجھ دار ڈاکٹر نے ہمارا تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد ہمیں ''پاگل'' ہی قرار دیا۔ ہمیں حیرت ہوئی اور ہم نے اپنے اور اس کے دونوں کے پاگل پن کی وجہ پوچھی تو ڈاکٹر نے ہمیں سمجھایا کہ:

''دیکھو بھائی اس زمانے میں جو آدمی سچ بولتا ہے وہ بلاشبہ پاگل ہے۔ سچ بولنے والے تو کبھی کے اس دُنیا سے اٹھ گئے۔ سچ بولنے کے جرم میں سقراط زہر پی کر مر گیا۔ منصور پھانسی پا گئے۔ سچ

پوچھو تو سچ پیغمبروں کے ساتھ ہی اس دُنیا سے اُٹھ گیا۔"

ڈاکٹر کی اس بات نے ہمیں قائل کر دیا اور ہم نے اس سے کہا۔

"لیکن ہم پاگل خانے میں نہیں رہنا چاہتے۔"

تو ڈاکٹر نے اس کی صرف ایک ہی صورت بتائی کہ:

"اگر تم یہ وعدہ کرو کہ تم کبھی سچ نہ بولو گے، مظلوم کی طرفداری نہ کرو گے کوئی کام ایمانداری سے نہ کرو گے تو میں ابھی تمہیں عقلمندی کا سرٹیفکٹ دے سکتا ہوں۔"

ہم نے ڈاکٹر سے کہا۔

"لیکن سچا وعدہ کرنا بھی تو پاگل پن ہوگا۔"

ڈاکٹر ہماری یہ بات سُن کر بہت خوش ہوا اور ہمیں فوراً پاگل خانے سے نکال باہر کیا۔

پاگل خانے سے باہر نکل کر جب ہم پھر اپنی دنیا، اپنے شہر اور اپنے محلّے میں واپس آئے تو حیران ہو کر سوچنے لگے کہ:

"ہم پاگل خانے سے باہر آئے ہیں؟"

یا

"نقلی پاگل خانے سے پھر اصلی پاگل خانے میں لوٹ آئے ہیں؟"

ایک بادشاہ اور ایک کسان

پُرانے زمانے کا ذکر ہے۔

کسی دیہات میں ایک نوجوان دیہاتی ایسا بھی تھا جسے اپنے ملک کے بادشاہ کو ایک نظر دیکھنے کا بہت شوق تھا۔

وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ بادشاہ آخر کیسا ہوتا ہے؟

بچپن ہی سے کہانی سُنانے والی نانی سے بادشاہوں کی کہانیاں سُنتے سُنتے اس نوجوان کے دل میں بادشاہ کو دیکھنے کی خواہش نہایت بچپن ہی سے بے قرار تھی۔

وہ سُنا کرتا تھا کہ بادشاہ عالی شان محل میں رہتا ہے۔ زرق برق کپڑے پہنتا ہے۔ روزانہ بریانی، پلاؤ، مرغ وغیرہ کھاتا ہے۔ اس کی ملکہ نہایت خوبصورت عورت ہوتی ہے۔ جس کا جسم سونے چاندی ہیرے جواہرات کے زیورات سے لدا ہوا ہوتا ہے۔ اس کے بیٹے کوئی کام دھام نہیں کرتے۔ دن بھر شکار کھیلا کرتے ہیں۔ اس کی بیٹیاں ''شرطیہ شادیاں'' کرتی ہیں۔ یعنی جو نوجوان کانے دیو کے غار سے سیاہ رنگ کا ایسا طوطا لے آئے جو بات کرے تو اس کے منہ

سے ہیرے موتی وغیرہ گریں۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس نوجوان دیہاتی کے دل میں ایک خواہش یہ بھی تھی کہ وہ بھی بادشاہ بن جائے۔

"بیٹا۔ تو کیسے بادشاہ بن سکتا ہے! کسی کو بادشاہ کسی کو فقیر تو اللہ میاں بناتا ہے۔"

یہ سُن کر نوجوان مایوس ہو جاتا اور آسمان کی طرف دیکھ کر اللہ میاں سے پوچھتا۔

"کیوں جی اللہ جی۔ تم نے مجھے بادشاہ کیوں نہیں بنایا؟"

اس دیہات میں مسجد کے پُرانے ملاّ جی مر گئے تو شہر سے ایک مولوی جی مسجد کے پیش امام ہو کر آئے۔ یہ مولوی جی بڑے پڑھے لکھے بڑے عالم اور عقلمند آدمی تھے۔

حلوہ کہیں، کہیں پہ چپاتی اُڑاتے تھے
مفلس کوئی بلاوے تو منہ کو چھپاتے تھے

یہ پرانے ملاّ جی وہی ملاّ جی تھے۔ جو بکری کی گردن بھی کٹواتے تھے اور ہانڈی بھی پھڑوا دیا کرتے تھے۔ اس بکری اور ہانڈی کا قصّہ یوں ہے کہ کسی دیہاتی کی بکری کا منہ ہانڈی میں پھنس گیا۔ لوگ (اس ہانڈی سے) نقاب پوش بکری کو لئے ملاّ جی کے پاس پہنچے تو ملاّ جی نے کہا کہ:

"بکری کی گردن کاٹ دو۔"

بکری کی گردن کٹ گئی تو حکم دیا کہ:

"اب ہانڈی پھوڑ کر بکری کا سر باہر نکال لو۔"

نئے مولوی جی ایسے نہ تھے۔ سچ مچ بڑے قابل تھے۔ اس لئے ایک دن نوجوان دیہاتی ان کے پاس گیا اور پوچھا۔

"مولوی جی... آپ تو بڑے سیانے ہیں، ذرا مجھے یہ بتاؤ کہ بادشاہ کیسا ہوتا ہے؟"

مولوی جی نے اسے سمجھایا۔

"بھائی! بادشاہ بھی تمہاری طرح ایک انسان ہوتا ہے۔ اس کے بھی ہاتھ پاؤں آنکھ، ناک، کان، چہرہ، جسم، سب کچھ ہماری طرح ہوتا ہے۔"

یہ سُن کر دیہاتی بہت حیران ہوا اور پوچھا۔

"جب بادشاہ بھی ہماری طرح ہوتا ہے تو پھر وہ محل میں کیوں رہتا ہے اور میں جھونپڑی میں کیوں رہتا ہوں۔ پلاؤ زردہ کیوں کھاتا رہتا ہے؟ اور میں دال روٹی کیوں کھاتا ہوں؟ کیاں میں بادشاہ نہیں بن سکتا؟"

مولوی جی نے کہا۔

تم بھی بادشاہ بن سکتے ہو۔ اب وہ زمانہ گیا۔ جب بادشاہ کا

بیٹا بادشاہ ہوتا تھا۔اب ہمارے مذہب اور نظامِ جمہوریت نے اس طریقے کو ختم کر دیا ہے کہ بادشاہ کا بیٹا بادشاہ بنے۔اب ہم انسانوں میں جو شخص پڑھا لکھا، عقلمند، ایسا سچا اور ایماندار ہو کہ سب انسان اس سے محبت کریں اور اس کی عزت کریں، تم بھی اگر پڑھے لکھے ہوتے تو تم بھی بادشاہ بن سکتے تھے۔

یہ سُن کر دیہاتی کو بڑا دُکھ ہوا کہ وہ بچپن میں پڑھنے لکھنے سے کیوں جی چراتی رہا۔لیکن گھر آکر جب نوجوان دیہاتی نے مولوی سے اپنی گفتگو نانی کو سُنائی تو نانی نے مولوی کو بے نقط سُنائیں اور نواسے کو ہدایت کہ وہ آئندہ سے مولوی کی باتوں پر دھیان نہ دے۔نانی کا اصرار اب بھی یہی تھا کہ:

"اللہ میاں بادشاہ کو عام انسانوں سے الگ بناتا ہے۔"

ایک دن دیہات میں بڑا شہرہ ہوا کہ بادشاہ شکار کے لئے آرہے ہیں اور وہ اس دیہات سے گزرے گا۔

دیہاتی نوجوان کو بڑی خوشی ہوئی کہ چلو آج برسوں کی آرزو پوری ہوگی۔آج میں بادشاہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں گا۔چنانچہ وہ نوجوان دیہاتی بھی دوسرے دیہاتیوں کے ساتھ اس سڑک پر کھڑا ہوگیا۔جدھر سے بادشاہ گزرنے والا تھا۔

تھوڑی دیر بعد بادشاہ کی سواری آئی۔ بادشاہ ہاتھی پر سوار

تھا۔ بڑے بوڑھے دیہاتی، بادشاہ کو نذرانہ پیش کرنا چاہتے تھے اس لئے بادشاہ چوپال پر پہنچ کر ہاتھی سے اترا تو نوجوان دیہاتی نے بڑی حیرت سے دیکھا کہ بادشاہ نہایت پستہ قد، چھوٹا، ناٹا اور موٹا تھا۔

نوجوان دیہاتی جو چھ فٹ لمبا تڑنگا جوان گھبرا رہا تھا۔ بادشاہ کو دیکھ کر کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ اور بڑی اونچی آواز سے بولا۔

"ارے یارو.... بادشاہ تو مجھ سے بھی چھوٹا ہے۔"

یہ آواز بادشاہ نے بھی سُنی اور بڑے غصّے سے بولا

"اس گستاخ کو ہمارے سامنے پیش کرو۔"

شاہی دیوان نے نوجوان دیہاتی کو پکڑ لیا اور بادشاہ کے روبرو شاہی ادب کے تحت پیش کیا۔ شاہی آداب کے تحت لمبے تڑنگے دیہاتی کو گھٹنوں کے بل بادشاہ کیسامنے جھکنا پڑا تو بادشاہ نے پوچھا۔

"اب بتا.... تو بڑا یا میں بڑا.....؟"

نوجوان دیہاتی نے اعتراف کیا۔

"اب تو آپ ہی بڑے ہیں مائی باپ۔"

سبق

دنیا میں سب انساں برابر ہیں، نہ کوئی بڑا ہے، نہ کوئی چھوٹا۔

ہاں اگر آپ کسی انسان کے آگے گھٹنوں کے بل جھک
جائیں تو پھر وہ انسان بڑا اور آپ چھوٹے۔
(خواہ آپ اس انسان سے کتنے ہی لمبے اور وہ انسان آپ
کے مقابلے میں کتنا ہی پستہ قد کیوں نہ ہو۔)
پس ثابت ہوا کہ کسی انسان کو اپنے جیسے دوسرے انسانوں
کے سامنے گھٹنوں کے بل ہرگز نہیں جھکنا چاہیئے۔
(تمّت بالخیر)

جُوں کا تُوں

حکام کے بارے میں عوام کی یہ شکایت بڑی عام ہے کہ:

''حکام کے کان پر جوں نہیں رینگتی''

جس کی وجہ سے عوام کی ہر تکلیف اور ہر شکایت جُوں کی تُوں باقی رہتی ہے۔

اب جُوں جُوں ہم جوں اور عوام کی اس شکایت پر غور کرتے چلے جاتے ہیں۔ تُوں تُوں ہم پر اس حقیر ترین کیڑے ''جُوں'' کی اہمیت واضح ہوتی چلی جاتی ہے۔

اور اب تو ہمیں یہ یقین سا ہوتا جا رہا ہے کہ ہماری حکومت اور معاشرے میں جتنی خرابیاں پائی جاتی ہیں اس کی اصل جڑ صرف یہ ہے کہ ہمارے حکام کے سر کے بالوں کی جڑ میں کوئی ''جوں'' نہیں ہے۔ بشرطیکہ حکام کے بال جڑ سے جھڑ نہ گئے ہوں۔

اب تک تو ہم جُوں کو ایک بڑا حقیر اور بے مصرف کیڑا سمجھا کرتے تھے اور جب تک کہ ہمیں کراچی جیل میں نہیں ٹھونسا گیا تھا۔ اس وقت تک ہمارا ذہن ''جوں'' کی طرف کبھی گیا ہی نہیں تھا۔

لیکن کراچی جیل میں پہلی رات جب ہمیں ''کھولی'' کے ننگے فرش پر ایک کمبل بچھانے کے لئے اور ایک کمبل اوڑھنے کے لئے دیا گیا تو ہمیں تھوڑی دیر بعد پتہ چل گیا کہ ان کمبلوں میں روئیں کم اور جوئیں زیادہ ہیں...

اور ہم ساری رات ''جوں'' کے بارے میں غور کرتے رہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ نے حقیر سے حقیر کیڑے کو بھی بے مصرف پیدا نہیں کیا ہے۔ یعنی اس حقیر سے حقیر کیڑے کا مصرف یہ ہے کہ وہ قیدیوں کو (حتیٰ کہ سیاسی قیدیوں کو بھی) رات بھر سونے نہ دے۔

عرصۂ دراز تک ہم ''جوں'' کی جیل کی چار دیواری تک اس محدود ''افادیت'' سے واقف تھے لیکن آج جوں ہی ''جوں'' کے بارے میں عوام کی اس شکایت پر ہماری نظر پڑی کہ:

''حکام کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔''

تو جوں کی ''محدود افادیت'' بھی ہم پر عیاں ہوگئی۔

اور آج تو ہم علی الاعلان کہتے ہیں کہ ہمارے ملک کی ساری خرابیوں کو نہ جمہوریت یا بنیادی جمہوریت دور کرسکتی ہے اور نہ اسلامی شوشلزم۔

اگر ملک کی ان ساری خرابیوں کو کوئی دور کرسکتی ہے تو صرف ننھّی سی ''جوں'' دور کرسکتی ہے۔ یعنی جوئیں یا جوں اگر حکام کے

کانوں پر رینگنا شروع کر دیں تو حکام کو عوام کی شکایت اور تکالیف کو دُور کرنے کا احساس ہو اور وہ اس احساس کی بدولت سر سے حُک کام ہی نہ رہیں.... بلکہ کام بھی کرنا شروع کر دیں۔

اب سوال یہ ہے کہ حکام کے سروں میں جوئیں کہاں سے آئیں؟ بیشتر حکام فارغ البال ہوتے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ گنج...گنج کی نشانی ہوتی ہے۔

اور اس کا ثبوت یوں ہے کہ ''گنج قارون'' والے قارون بھی گنجے تھے۔

اب رہے وہ حکام جو فارغ البال تو ہیں مگر گنجے نہیں ہیں وہ شیمپو اور ہیئر ڈریسنگ کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔اس لئے ان کے سروں میں جوں کے وجود کا کوئی امکان نہیں رہتا۔

جب جُوں کا امکان ہی نہیں تو پھر وہ کان پر کیسے رینگے؟ اور وہ کان پر نہ رینگے تو انہیں کیسے احساس ہو کہ عوام کیوں ان کے کان کھا رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ جوں کی کان پر عدم موجودگی کے باعث عوام کی جو بھی بات سُنیں گے تو ایک کان سے سُن کر دوسرے کان سے اُڑا دیں گے۔

لیجیے ہو چکی.....دوکان داری!

حکام تو حکام.... یہ عوام بھی ہماری سمجھ میں نہیں آتے۔

جھوپڑیوں میں مکین اور میلے کچیلے گندے کپڑوں میں ملبوس رہتے ہیں یعنی مفلسی کے باعث اِن کے جوئیں پڑی ہوئی ہیں اور وہ حیران ہو رہے ہیں کہ:

"حکام کے کان پر جُوں نہیں رینگتی"

جُوں تمہارے مکان میں ہو تو حکام کے "کان" پر کہاں سے آئے؟

مگر عوام حکومت کے نظم و نسق سے ایسے چُن چُن کر کیڑے نکال رہے ہیں جیسے بے بے اللہ رکھی اپنی بہو بی بی بھاگاں کے سر سے چُن چُن کر جوئیں نکال رہی ہو یعنی

.........حکومت یہ نہیں کرتی حکومت وہ نہیں کرتی۔

.........سڑکوں پر خونی حادثات کی روک تھام کا بندوبست نہیں کرتی۔

.........نواحی بستیوں سے شہر تک بسوں کے کرائے کم نہیں کرتی۔

.........کوارٹروں سے مہاجروں کی بے دخلی کو نہیں روکتی۔

.........مچھّر نہیں مارتی وغیرہ وغیرہ۔

.........اور وغیرہ وغیرہ پر دھیان نہیں دیتی۔

حیرت ہے کہ ہمارے رہنما سب کے سب بنیادی جمہوریت، اسلامی سوشلزم، اور جمہوریت کی تو بڑی باتیں کرتے ہیں لیکن نیچے جڑ کی طرف کوئی نہیں دیکھتا۔

جڑ جس میں جُوں ہوتی ہے۔

حد تو یہ ہے کہ ہماری عورتیں ''جوئیں مارنے'' کو ابھی تک فصیح اوقات کا دلچسپ ذریعہ (good part time) سمجھتی ہیں۔

حالانکہ اس وقت ملک کو جوؤں کی شدید ضرورت ہے ان کی افزائشِ نسل ضروری ہے اور پھر انہیں حکام کے بالوں میں جھونکنا وقت کی ایک بہت بڑی قومی خدمت ہے۔

اور جوئیں بھی ایسی ''ٹرینڈ'' ہوں کہ جہاں عوام نے کوئی شکایت کی، حکام اسے سُنیں نہ سُنیں ''جوں'' ضرور سُن لے اور سُن کر فوراً حکام کے کان پر رینگنے لگے تاکہ حکام عوام کی شکایات کو ایک کان سے نہ اُڑا سکیں۔

اس کے بعد پھر دیکھئے گا کہ جُوں ہی جوں حکام کے کان پر رینگے گی۔ حکام فٹافٹ عوام کی شکایات اور تکالیف دور کرنے میں مصروف ہو جائیں گے۔

اسی لئے دعا مانگئے کہ:

''ربّا.... جُوں نوں جیوں دے۔''

ورنہ پھر ہماری اس بات کو پتھر کی لکیر سمجھئے کہ:

''جو ''جُوں'' نہیں تو پھر سب کچھ ''جُوں کا تُوں'' رہے گا۔

سرِ شام جونہی آنکھ میری لگی

ڈاکٹر اور حکیم کہتے ہیں کہ:

''جلد سونا صحت کی نشانی ہے۔''

اور عقلِ سلیم کہتی ہے کہ:

''جلد سونا حماقت کی نشانی ہے۔''

ممکن ہے۔ دنیا میں ناممکن کوئی کام نہ ہو۔ لیکن جلد سونا یقیناً ناممکن ہے۔ یا اگر ممکن ہے تو پھر ناممکن قسم کا ممکن ہے۔

ہم تو یہاں ایسی ''آپ بیتی'' بیان کرتے ہیں کہ جس پر ''جگ بیتی'' کا گمان ہو۔

گزشتہ اتوار کو ہمارے ایک پیارے دوست مسٹر ایکس وائی زیڈ کی بیگم لندن جانے والی تھیں۔ لندن سے ہمارے دوست مسٹر ایکس وائی زیڈ نے بڑی تاکید کا خط ہمیں لکھا تھا کہ

''میری بیگم پہلی بار لندن آ رہی ہیں۔ اس لئے تمہاری ڈیوٹی لگاتا ہوں کہ تم اپنی بھابھی کو خود ہوائی جہاز میں سوار کرا دینا۔ واللہ تم کو سخت تاکید ہے۔''

ہمیں یہ خط پڑھ کر بڑا غصّہ آیا۔ غصّہ اس لئے نہیں آیا کہ ہمارا دوست بھی عجیب لُولُو ہے جو لندن میں رہ کر گھر سے بیوی منگواتا ہے۔ بلکہ غصّہ اس لئے آیا کہ ہوائی جہاز علی الصبح پانچ بجے جاتا تھا۔

مسٹر ایکس وائی زیڈ کے اس حکم کا مطلب تو یہ ہوا کہ دو بجے رات سے اٹھو، نہا دھو کر تین بجے تک خود تیار ہو اور ساڑھے تین بجے تک بیگم ایکس وائی زیڈ کی کوٹھی پر پہنچو۔ اور انہیں لے کر چار، سوا چار بجے تک ہوائی اڈے پر پہنچو، کیونکہ ہوائی جہاز کی روانگی سے ایک گھنٹہ پہلے ہوائی اڈے پر پاسپورٹ اور کسٹم چیکنگ کے لئے موجود ہونا ضروری ہوتا ہے۔

لیکن مسٹر ایکس وائی زیڈ ہمارے جگری دوست ہیں اور پردیس سے انہوں نے ایک خدمت ہمیں سونپی تھی اور اس کے علاوہ ایکس وائی زیڈ کی ہم ایسی ہی عزّت کرتے ہیں جیسی کہ

"بھابھی نہیں وہ میری ماں ہے۔"

اس لئے ہم نے تہیہ کرلیا کہ چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے ہم "بڑی بی" کو ہوائی جہاز میں بٹھائے بغیر باز نہیں آئیں گے۔" (یعنی واپس نہیں آئیں گے)

ہفتے کی رات سرِ شام ہم گھر لوٹے کہ جلدی سو جائیں تا کہ جلدی جلدی جاگ اُٹھیں۔

بچے حیران کہ برسہا برس کے بعد باپ رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھا رہا ہے۔ بیوی پریشان کہ
"خدانخواستہ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے جو جلدی سونا چاہتے ہو۔ کہو تو ڈاکٹر کو بلوا لوں۔"
گویا جلد سونا صحت کی نشانی نہیں، بیماری کی نشانی ہے!
خیر، بہر حال بیوی کو وجہ بتائی۔ بیوی نے اطمینان کی سانس لی اور ہم نے اوپر رضائی لی۔ اس وقت آٹھ بج رہے تھے۔
بچپن کے بعد پہلی بار آٹھ بجے بستر پر لیٹے تھے اس لئے عجیب عجیب معلوم ہوا۔ نیند کے بجائے شرم آ رہی تھی کہ ابھی ریڈیو سے بچوں کو سلانے والی کہانی بھی نشر نہیں ہوئی کہ بچوں سے پہلے بستر پر لیٹ گئے نیند لانے کے لئے ناچار "بھیڑیں گننی شروع کر دیں۔" ایک دو تین......
کچھ غنودگی طاری ہوئی تھی کہ بھیڑیں پکارنے لگیں۔ ہڑبڑا کر جاگے تو پتہ چلا کہ ہماری دو بچیاں آپس میں لڑ پڑی تھیں۔ یعنی بڑی آپا اور چھوٹی آپا میں "آپا دھاپی" ہو گئی تھی اور دونوں کی دونوں دھائیں دھائیں رو رہی تھیں۔ بڑی مشکل سے بیگم نے انہیں چپ کرایا۔ پھر سناٹا سا ہو گیا اور پھر آنکھ لگنے لگی کہ اچانک "پھٹ پھٹ، پھٹ پھٹ، شروع ہوئی۔ پتہ چلا کہ پڑوسی موٹر رکشہ میں گھر آیا

ہے..........موٹر رکشا والا بھی چیخ رہا ہے اور موٹر رکشا بھی شور مچا کر مالک کا ساتھ دے رہا ہے۔

خدا کا شکر کہ معاملہ جلدی طے ہو گیا۔ موٹر رکشا چلی گئی اور ہم نے آنکھوں پر پھر پلکیں ڈھانپ لیں۔

اب نو بجا چاہتے تھے۔ اچانک عورتوں کی لڑائی کا شور مچ گیا۔

''ہڑ دنگی، کلموہی، ٹکیہ چوٹی، جھٹّل، شُفتل، جوئی خور، پچھل پائی، دیدہ پھٹ۔''

بیوی کی آواز آئی۔

''ارے کوئی ریڈیو بند کرو جلدی۔''

دل سے آہ نکلی... ریڈیو پاکستان کے اسٹوڈیو نمبر نو سے بقول بھائی کلّن دلّی والے۔

''ڈرامہ ہو رہا تھا۔''

ریڈیو بند ہوا تو آنکھیں بند ہوئیں۔ ہلکی سی غنودگی طاری ہوئی تھی۔

کہ دروازے پر بڑی زور زور کی دھڑ دھڑ ہوئی اور ساتھ ہی آواز آئی۔

''اماں کیا سو گئے.....! ابھی سے سو گئے؟

بھئی کیسے ''علیگیرین'' ہو! علی گڑھ میں کہیں ''ڈے اسکالر''
تو نہیں تھے!''

ہمارے علیگ دوست فصیح الدین علوی تھے۔ جی چاہا کہ
پوچھوں، کیوں بھئی......! کیا علی گڑھ میں چمگادڑ اور اُلّو پڑھا کرتے
تھے؟

لیکن ہمارے بچّے نے ہماری طرح جھوٹ بول کر ہماری
نیند بچائی کہ

''ابّا سو رہے ہیں اس لئے امّی نے کہا ہے کہ ابّا ابھی گھر نہیں
آئے۔''

ساڑھے دس بج چکے تھے۔ رات کا سنّاٹا پھیل رہا تھا کہ پڑوس
کے شادی کے گھر سے فلمی ریکارڈ گراموفون پر بجنے شروع ہوئے۔
ہم تو آنکھیں بند کرنا چاہتے تھے اور کوئی نسیم بیگم یا اقبال بانو
گراموفون کے بھونپو سے ہمیں ڈانٹ رہی تھی۔

نجریا ملا۔ نجریا ملا۔ نجریا ملا
رسیلے مورے نیناں نجریا ملا

گراموفون ریکارڈ بند ہوئے تو عورتیں ڈھولک لے بیٹھیں۔
اور نہایت بھونڈی آواز میں الاپنے لگیں۔
گوری گھونگھٹ میں مکھڑا چھپا نا نہ!

یہ تو نیناں لڑانے کی رات ہے

''انّا للہ و انّا الیہِ راجعون..... بی بیو.....! یہ نیناں لڑانے کی رات نہیں بلکہ یہ تو نیناں موندھ کر سو جانے کی رات ہے کیونکہ ''بڑی بی'' علی الصبح لندن جارہی ہیں۔''

غالباً بیوی نے دل کی آواز سن لی۔ وہ چُپ ہوئیں۔ ابھی خُدا کا شکر پوری طرح نہ ادا کر پائے کہ قوّال شروع ہو گئے۔

مورے آقا دی کملی ہے کالے رنگ دی

مورے آقا دی کملی ہے۔ اہے واہ

آں آں آں۔ ہاں ہاں ہاں۔ آں آں

مورے آقا دی کملی ہے کالے رنگ دی

مجبوراً کانوں پر رضائی خوب اچھی طرح ڈھانپ کر سونے کی کوشش کی اور سو بھی گئے لیکن تھوڑی ہی دیر میں ٹیلیفون بجنے لگا۔

ٹوں..... اونک..... ٹوں..... ہنک.....

رسیور اُٹھایا تو آواز آئی۔

''ہیلو۔ ابرام بھائی ہے؟''

ہم نے پوچھا۔

کون ابرام بھائی؟

آواز آئی۔

''ارے اپنا ابراہیم سیٹھ بانٹوے والا۔''

ہم نے غصّے سے پوچھا۔

آپ کون بول رہے ہیں؟

آواز آئی۔

''ہم گپھار بھائی (غفار بھائی) بولتا ہوں۔''

ہم نے غصّے سے جواب دیا۔

اِدھر کوئی ابرام سیٹھ نہیں رہتا ہے۔ رانگ نمبر۔''

جواب آیا۔

''اوہ سوری۔ رونگ نمبر۔ ماپھ کرنا۔

گپھار بھائی کو ماپھ کر کے گھڑی پر جو نگاہ کی تو دو بج رہے تھے۔ اب کیا سونا..... سونا نہ..... جلدی جلدی نہا دھو کر بیگم ایکس وائی زیڈ کی کوٹھی پر پہنچے اور

بھابی کی جو بالیں پہ ہوا شور ہمارا

خدّام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

بیچاری وہ بھی ہماری طرح سونے کی کوشش کرتے کرتے ابھی ابھی سوئی تھیں..... انہیں جگایا..... بھاگم بھاگ ہوئی اڈے پہنچے تو یہ اعلان سُنا۔

''موسم کی خراب کے باعث ہوائی جہاز آج لندن نہیں جائے گا؟

بات تیری، تیری بیڑہ غرق!
کار میں ہوائی اڈے آئے تھے۔
بے کار میں ہوئی اڈے گئے تھے۔
ناچار پھر گھر لوٹے تو سویرا ہو چکا تھا۔
رات تو ہم جلدی نہ سو سکے تھے البتہ علی الصبح سویرے ہی سے سو گئے۔
چلئے...... ایک طرح سے یہ بھی ایک نعمت ہے کہ ہم جلدی نہیں سوتے اور ہم میں بڑی "بیداری" ہے۔
لیکن جلد نہ سونے کے باوجود قوم کا یہ حال ہے تو اگر ہم جلدی سونے لگ جائیں؟
تو پھر یارو... باقی رہے نام اللہ کا!

پتے کی بات

دنیا کا کوئی انسان ایسا نہیں ہے جس کا کوئی پتہ نہ ہو (بشرطیکہ کہ وہ لاپتہ نہ ہو) یہ ممکن ہے کہ بہت انسانوں کے دفتر کا کوئی پتہ نہ ہو، ''تار کا پتہ'' کوئی نہ ہو مگر ان کے گھر کا پتہ ضرور ہوتا ہے۔ مثلاً

خاص در شہر کراچی

یہ چھٹی بھنگی کالونی میں زچہ کی قبر کے روبرو کالے خاں کی ہوٹل کی بغل میں کالی جھگی کے میاں چنوں کو مل کر میاں مٹھو کو برسد۔

یہ تو خیر خاصا لمبا اور پرانا پتہ ہے۔ مگر ماڈرن اور مختصر پتہ یوں بھی ہو سکتا ہے۔

''۴۲۰۔ فراڈ آباد۔ کراچی۔''

پتہ لمبا ہو یا مختصر.... ہر انسان کا (کم از کم) گھر کا پتہ ضرور ہوتا ہے! اگر کسی بدقسمت انسان کا کوئی گھر نہ ہو تب بھی وہ ''معرفت'' کی منزلیں طے کر کے اپنا کوئی نہ کوئی پتہ ضرور مقرر کر لیتا ہے۔ یعنی

انشاء اللہ خاں معرفت ماشاء اللہ خاں۔ مالک سبحان اللہ

ہوٹل، احسان اللہ روڈ عرفان اللہ آباد۔

الحمداللہ۔ کہ اس دنیا میں کوئی انسان بے پتہ نہیں۔ اگر بالفرض ایسا کوئی انسان ہے بھی تو ہمیں اس کا پتہ نہیں۔ کیا پتہ سچ مچ کوئی انسان ایسا بھی ہو جس کا کوئی پتہ ہی نہیں ہو۔ لیکن اتنے بہت سے انسانوں کی دنیا میں ایسے لاپتہ انسان کا پتہ چلانا بہت مشکل ہے۔

بہر حال ''پتے کی بات'' تو یہ ہے کہ کوئی انسان بغیر اتے پتے کے اس دنیا میں زندہ تو رہ سکتا ہے۔ لیکن انسانوں سے مل جل کر نہیں رہ سکتا۔

یہ ممکن ہے کہ کسی انسان کا سدا ایک پتہ نہ ہو، اور ہم کسی شخص کو اس کے پتے پر خط لکھیں تو ہمیں ٹوک دے کہ

''اماں تمہیں کچھ پتہ بھی ہے کہ اس کا پتہ بدل گیا ہے۔''

چنانچہ اس کے بعد پتہ لگانا پڑتا ہے کہ اس شخص کا نیا پتہ کیا ہے؟

بعض لوگ جن کا کوئی پتہ نہیں ہوتا وہ کسی پتہ والے شخص کی منت کرتے ہیں۔

بابو جی..... اگر چٹھیاں آپ کے پتے پر منگوالوں تو کوئی ہرج تو نہیں۔''

ایک ملاح نے کہا۔ ''اور ہم کہاں سے کھائیں؟ سارے دن میں بیاس پار کتنے آدمی اترے ہیں؟ ان چند پیسوں میں مشکل سے گذارا ہوتا ہے۔ ہم نے تمہیں دو دو پیسے فی آدمی چھوڑ دیے۔ اب تم ایک ایک پیسہ بھی نہیں دیتے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟''

پرکاش نے دس پیسے ملاح کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔

ایک بوڑھے کسان نے آبدیدہ ہوکر کہا۔ ''بھگوان تمہارا بھلا کرے۔ یہ میرا کنبہ ہے۔ میں بھی کبھی مال مویشی والا تھا۔ میرا گھر پکی اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ ابھی کل تک میری کھیتیاں لہلہاتی تھیں۔ میرے دوارے پر بھکاری بھیک مانگتے تھے۔ میری بہوئیں اور بیٹیاں آنگن میں گیت گاتی تھیں۔ آج وہ بین کر رہی ہیں۔ بھگوان! میں نے ایسی بپتا کبھی نہ دیکھی تھی۔ اب دربدر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ کہیں سر چھپانے کو جگہ نہیں ملتی۔ پیٹ بھر کھانے کو روٹی نہیں۔ ایسا قحط میں نے اپنی ساری عمر میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ بھگوان! یہ کن کھوٹے کرموں کی سزا ہے؟''

برجندر نے کہا۔ ''تم ایک دو آدمی ہمارے ساتھ چلو۔ ہم تمہیں آٹا دال اور نون سب کچھ دیں گے۔''

بوڑھا کسان بولا۔ ''پرماتما تمہارا بھلا کرے!''

ایک بوڑھی عورت بولی۔ ''اری لڑیا! جا سرکنڈے، گھاس

پھوس اور لکڑیاں اکٹھی کر لے۔ اری بنو! لحاف اور چٹائیاں اور برتن مچھوے سے اتار کر اِدھر لے آ۔ ارے سادھوا کمبخت کدھر بھاگ گیا تو.....''

لڑیا اٹھی اور سرکنڈوں کے جھنڈ کی طرف چلی۔ وہ ایک سانولے رنگ کی جوان عورت تھی۔ پرکاش نے دیکھا اس کی چولی اور لہنگا جگہ جگہ سے پھٹ رہا تھا۔ اور وہ چلتے چلتے اپنی جوانی کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ لیکن غریبی میں نہ تو غریبی ہی چھپتی ہے اور نہ جوانی.....

دریا سے واپس آ کر پتہ چلا کہ بارات دوسرے دن شام کو سری پور پہنچ جائیگی۔

لڑکے والوں کا نائی آیا تھا۔ اور اب وہ ایک بڑی گلابی رنگ کی پگڑی باندھے آنگن میں لکڑی کے تخت پوش پر بیٹھا ہوا حقّہ پی رہا تھا۔ اس خبر نے گھر والوں کو چونکا دیا۔ برات آئے گی یہ بھی سب جانتے تھے۔ لیکن یہ جانتے ہوئے بھی دل میں ایک واہمہ سا تھا۔ لیکن اب واہمہ دور ہو گیا اور اب اس کی جگہ ایک اضطراب، ایک عجیب قسم کی بے چینی اور عجلت نے لے لی۔ چاچا پھیرو جو قصبے میں حلوائی کی دوکان کرتے تھے اور پینتالیس برس گذر جانے پر بھی مجرو تھے۔ دوڑتے ہوئے لاریوں کے اڈے پر گئے۔ تاکہ کل کے لئے

بٹالے سے برف منگوانے کا انتظام کریں۔ منگت رائے اور برجندر کو
برات گھر میں صفائی کروانے، برات گھر سجانے اور براتیوں کے
لئے چارپائیاں بچھوانے کا کام سپرد ہوا گھر میں آئی ہوئی عورتوں کے
دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اور ساڑھیوں اور قمیصوں کے رنگ
شوخ تر ہوتے گئے۔ بیرا اپنے باپ کی چاندی کے دستے والی چھڑی
لے کر اِدھر اُدھر گھومنے اور جھیوروں کو چستی سے کام کرنے کی ہدایت
کرنے لگا۔

بیٹھک میں اب صرف پرکاش اور چونی لال اور بوٹا سنگھ رہ
گئے۔ پرکاش کھڑکی سے ان عورتوں کی طرف دیکھنے لگا جو گھر کے
بڑے دروازے سے اندر آرہی تھیں یا باہر جارہی تھیں۔ ریشمیں
لباس سرسراتے ہوئے قمیصیں جن پر سنہری پھول بوٹے بنائے گئے
تھے۔ چنریاں جن پر مقیش کے لہریئے تھے۔ پھر کبھی کبھی ان میں کوئی
خوبصورت چہرہ بھی نظر آجاتا۔ یوں ہی قصباتی سا حُسن، جس میں
رعنائی اور موہنی کا بجائے جوانی اور الھڑپن کی آمیزش زیادہ ہوتی۔
یکا یک چونی لال اور بوٹا سنگھ نے ایک ساتھ دبی سی چیخ ماری۔
سامنے دو لڑکیا جارہی تھیں۔ نینون کے بادامی دوپٹوں میں ان کی
چوٹیاں کالی ناگنوں کی طرح بل کھائی ہوئی تھیں اور ایک کی گردن
کے خم میں مدورا کے مندر لٹکے ہوئے نظر آرہے تھے۔ پرکاش کا چہرہ

شرم سے سُرخ ہو گیا۔ اُسے یہ خیال نہیں رہا تھا کہ کوئی اس کی بہنوں کو دیکھ کر خوشی سے چیخیں مار سکتا ہے۔ سوشیلا اور لیلا گلی میں چلتے چلتے ٹھٹھک کر رہ گئیں۔ اب مخالف سمت سے دو اور نوجوان اور حسین لڑکیاں آ رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر بوٹا سنگھ کے منہ سے پھر بے اختیار ایک دبی سی چیخ نکل گئی۔ ان دونوں جوان لڑکیوں میں سے ایک تو وہی دوشیزہ تھی جس نے بیر کو اور پرکاش کو لسی پلائی تھی۔

پرکاش نے پوچھا۔ ”وہ کون ہے؟“

”وہ کون؟“ چونی لال نے پوچھا۔

”وہ جو آسمانی رنگ کی ساڑھی پہنے ہوئے شرما سی رہی ہے اور مسکرا بھی رہی ہے اور.....“

چونی لال نے کہا۔ ”وہ!.....وہ مس اوورسیر ہے۔“ اور کہکر چونی لال اور بوٹا سنگھ دونوں ہنسنے لگے۔

”مس اوورسیر؟“

”ہاں، ہاں،“ بوٹا سنگھ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”اس کا باپ نہر کے محکمے میں اوورسیر ہے نا۔“

چونی لال نے بوٹا سنگھ کی طرف دیکھ کر رازدارانہ لہجہ میں کہا۔ ”میں نے سنا ہے کہ اورسیر کی تبدیلی جالندھر ہو گئی ہے اور اب وہ دو تین دن میں یہاں سے چلے جائیں گے۔“

''سچ مچ؟''

''ہاں۔ مجھے آج ہی پتہ چلا ہے، ایک بڑے معتبر آدمی سے۔لیکن یہ بات کسی کو بتانا نہیں۔ اگر اس نے سن لیا تو بس بے چارے پر قیامت گذر جائے گی۔''

''نہیں نہیں.... آہ بے چارہ۔'' اتنا کہہ کر بوٹا سنگھ ہنسنے لگا۔ چونی لال بھی اس کی ہنسی میں شامل ہو گیا۔ پرکاش نے سوچا، یہ لڑکے کیسے بد مذاق اور بے تربیت ہیں بالکل دیہاتی۔ وہ بیٹھک سے اٹھ کر گھر کے آنگن میں دری بچھ گئی تھی، ایک دیوار کے ساتھ گیس لیمپ لگ گیا تھا۔ اور کمسن لڑکیوں نے ابھی سے ڈھولک بجانی شروع کر دی تھی۔

کتھے گیوں! پردیسیا وے!

ٹِک ٹِک ٹک بجتی ہوئی ڈھولک پر ایک لڑکی پتھر کے ایک ٹکڑے سے تال دے رہی تھی، پرکاش نے سوچا ان نادانوں کو پتہ نہیں کہ وہ کیا گا رہی ہیں۔ پردیسی سے پیار کیوں؟ اس نے دیس دیس کے گیت سنے تھے۔ بلّوریں چشموں کے کنارے نیلی نیلی آنکھوں والی چرواہیوں کے گیت، اور ڈرائنگ روم میں ارغنواں پر گیت، جہاں گلدان میں لمبی لمبی ڈنڈیوں پر نرگس کے پھول جھکے ہوئے تھے۔ گیت جو دوپہر کی تپتی ہوئی اداسی میں گائے گئے۔ جب

فضا میں پیپل کے پتے کھڑکھڑا رہے تھے اور آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ گیت.... لیکن حیرانی کی بات تو یہ تھی کہ عورت کے ہر نغمہ میں پردیسی کے لئے پیار موجود تھا۔ یہ پیار کبھی تو مدھم سروں میں لرزنے لگتا اور کبھی اس کی گویائی کی حِس اتنی شدید ہو جاتی کہ وہ نغمہ کے الجھاؤ میں ایک زخمی پرندے کی طرح چیخ اٹھتا، لیکن پردیسی کے لئے اس قدر تڑپ کیوں؟ پرکاش نے پوچھا اور اسے خیال آیا کہ یہ نغمہ انسان کی فطرت کا نغمہ تھا۔ وہی نغمہ جس نے دور کی ہر شے کو پیارا بنا دیا تھا۔ جس نے بچپن میں اسے چاند کی طرف ہاتھ بڑھانے پر مجبور کر دیا تھا اور بڑا ہونے پر اسے بے قرار کر دیا تھا کہ وہ جنگلوں، پہاڑوں اور میدانوں کی خاک چھانے اور قدرت کو اپنا راز دار بنائے۔ یہ وہی انسانی فطرت کا نغمہ تھا جو ابھی تک عورت کی مقدس روح میں بے قرار تھا۔ یہ اچھا ہے پرکاش نے سوچا کہ غلام ہوتے ہوئے بھی عورت کے دل میں پردیسی کی چاہ موجود ہے۔ کیونکہ عورت زمین کی طرح ہے۔ وہ زندگی کی تخلیق کرتی ہے اور جس دن اس کے دل سے پردیسی کی چاہ اٹھ گئی انسانیت بھی فنا ہو جائے گی.... ٹِک ٹِک لڑکیوں نے ایک نیا گیت شروع کیا تھا۔

اونہوں لکھنا۔

اساں پردیسیاں نوں یاد رکھنا۔

پرکاش نے سوچا ان معصوم لڑکیوں کو پتہ نہیں کہ وہ کیا گا رہی ہیں۔ کسی پردیسی کو یاد رکھنے کے لئے ایک حسّاس اور دردمند دل چاہیئے، جوانی کی بے قرار روح نسائیت اور شباب اور اس کی نگاہوں میں پگڈنڈی پر چلتی ہوئی عورت کی تصویر کھنچ گئی۔ جس کے سر پر سرسوں کی سبز کونپلوں کا گٹھا تھا اور جس کی سبز قمیص پر نقرئی فیتہ چمک رہا تھا۔

اساں پردیسیاں نوں یاد رکھنا۔

ٹِک ٹِک ٹِک ٹِک پرکاش کو ایسا معلوم ہوا گویا کوئی اس کے بجتے ہوئے دل پر اسی پتھر کے ٹکڑے سے ضربیں لگا رہا تھا۔ ٹِک ٹِک ٹِک ٹِک اور وہ سیڑھیوں کی طرف دوسری منزل پر جانے کے لئے مڑا۔ سیڑھیوں کے درمیان اس نے بیر اور مس اوورسیئر کو دیکھا جو ایک دوسرے کے قریب کھڑے تھے۔ بیر کا چہرہ سفید تھا اور مس اوورسیئر کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ پرکاش جلد جلد زینے پر چڑھ گیا۔ بیر نے آہستہ سے کہا۔ "بھائی جان میں بھی اوپر آ رہا ہوں۔ ابھی....." دوسری منزل میں ایک بڑے کمرے میں بہت سی لڑکیاں پرکاش وتی کو گھیرے ہوئے تھیں۔ وہ دبے دبے قہقہوں اور میٹھی میٹھی سرگوشیوں کے ساتھ پرکاش وتی کو دولہا بھائی کی آمد کے قصے سنا کر چھیڑ رہی تھیں اور اپنی دبی ہوئی جنسی خواہشوں کی ناکام تکمیل کر رہی تھیں۔ پرکاش چند کو کمرے میں آتے دیکھ کر

ساری مجلس درہم برہم ہوگئی کئی لڑکیاں کھلکھلا کر ہنستی ہوئی اور ہنسنے کے باوجود بھی شرماتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں۔ اوروں نے جرات سے کام لیکر اسے اپنے نسوانی مزاح کا نشانہ بنانا چاہا۔ اتنے میں بیر آ گیا اور آ کر ایک کونے میں پڑی ہوئی چارپائی پر چپ چاپ لیٹ گیا۔ اس کا چہرہ سپید اور سُتا ہوا تھا اور اس کے بشرے سے معلوم ہوتا تھا کہ شاید اسے ابھی غش آنے کو ہے بہت سی لڑکیوں نے دیکھا اور اندازہ لگایا کہ کوئی غیر معمولی بات ہے اور وہ کمرے سے باہر چلی گئیں۔ پرکاش وتی دونوں جلد جلد بیر کے پاس گئے۔ پرکاش وتی نے اپنا ہاتھ بیر کے ماتھے پر رکھا۔ کہنے لگی۔ ''ماتھا گرم ہے۔''

پرکاش نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے بیر؟''

بیر نے رکتے رکتے کہا۔ ''اُف......کوئی بات نہیں۔ بس دم گھٹا جا رہا ہے۔''

پرکاش نے کہا۔ ''پانی پانی۔''

پرکاش وتی نے گھبرا کر کہا۔ ''پانی پانی۔''

باہر کئی لڑکیوں نے چیخ کر کہا۔ ''پانی پانی۔''

سارے گھر میں کہرام مچ گیا۔ پانی، پانی، بیر کی ماں دوڑتی ہوئی اوپر آئی اور ایک چھوٹے سے گلاس میں پانی اور گلاب ملا کر لائی۔ بیر نے تھوڑا پانی پیا اور کہا میں اب اچھا ہوں۔ کوئی بات

نہیں۔لیکن کسی نے اس کی ایک نہ سنی۔کوئی ماتھا دبانے لگا، کسی نے ہاتھ پکڑ لئے، کسی نے پاؤں کسی نے کہا کھڑکی بند کر دو ہوا لگ جائے گی۔کسی نے کہا کھڑکی کھولدو، ہوا لگنے دو۔ایک پھوپھی جان بولیں۔اسے دودھ میں گرم گھی ملا کر پلاؤ، پلایا گیا۔دوسری پھوپھی جان بولیں۔''اے ہے۔کہاں ہے بیر کی ماں؟ بیر کی ماں؟''

بیر کی ماں بولیں۔''میں تمہارے پاس ہی تو کھڑی ہوں۔''

''اچھا۔اچھا۔جا بھاگ کر نیچے سے بادام روغن لا۔''

بیر کی ماں نچلی منزل سے بادام روغن لانے گئی تو خالہ بھاگونتی اس کے پیچھے دوڑیں۔''ارّ.....ارّ.....میں کہتی ہوں، بیر کی ماں، اس کے تو ہاتھ پاؤں بھنک رہے ہیں۔بازارت کانشی پھل منگواؤ۔تاکہ پیروں پر اچھی طرح مالش کریں اور گرمی چھٹے۔اسے گرمی ہے اور کچھ نہیں۔'' بیر نے لاکھ انکار کیا کہ اسے گرمی نہیں تھی، محض دم گھٹا جا رہا تھا۔اور اب وہ بھی نہیں گھٹتا تھا اب اسے آرام تھا لیکن کسی نے اس کی ایک نہ مانی اور اسے آرام سے لیٹے رہنے کو کہا۔ ناچار بیر نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

کوئی آدھ گھنٹہ شور وغل کرنے، بیر کا سر سہلانے اور اس کے پاؤں اور ہاتھوں پر کانشی کی مالش کرنے کے بعد گھر کی عورتوں کی جان میں جان آئی، اور وہ اسے چار پائی پر آرام سے سویا ہوا چھوڑ کر

چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد فوراً بیر نے آنکھیں کھول کر کہا۔

''ہائے بھاپا جی۔''

پرکاش چند نے مسکرا کر پوچھا۔ ''چین کیسا ملک ہے؟''

بیر نے کہا۔ ''ہائے میں مر جاؤں گا، اب کیا ہوگا؟ ان کی تبدیلی ہوگئی ہے۔''

پرکاش چند نے کہا۔ ''سنا ہے شنگھائی میں بہت دل پسند کابرے ہیں اور اینگلو چینی عورتیں......''

بیر نے کہا۔ ''میں اس کے بغیر نہیں جی سکتا۔''

پرکاش نے کہا۔ ''اور چین کے لوگ چینی کے برتن بنانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔''

بیر نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ''ہائے بھاپا جی۔ ہائے بھاپا جی۔ اگر تمہیں پتہ ہوتا۔ اگر تمہیں پتہ ہوتا۔''

پرکاش نے کہا۔ ''مجھے سب پتہ ہے۔'' اور وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

کمرے کے باہر سیڑھیوں کے قریب کونے میں اس نے ایک لڑکی دیکھی۔ اس نے آسمانی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ وہ چپ چاپ کھڑی تھی۔ اس کی ناک سرخ تھی۔ اور آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی۔ پرکاش نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس

لڑکی نے اپنا چہرہ ساڑھی کے پلو میں چھپالیا۔ اور دیوار سے لگی لگی سسکیاں لینے لگی۔

یکا یک پرکاش نے سوچا۔ کل پرکاش وتی کی شادی ہے۔

☆☆☆

شادی کا رات پرکاش پل بھر کے لئے بھی نہ سو سکا۔ اس نے بیر کی ماں سے کہہ سن کر چارپائی دوسری منزل میں رکھوالی تھی۔ تا کہ آرام سے سو سکے۔ بیر کی ماں نے نہایت چاؤ سے پوچھا۔ ”بیٹا شادی نہیں دیکھو گے؟“ اور پرکاش نے بیر کی ماں سے کہا کہ وہ دو تین بجے کے قریب جب بیاہ کی رسمیں ادا کی جائیں گی، چارپائی سے اٹھ کر نیچے آنگن میں چلا آئے گا۔ لیکن اسے تو دو تین بجے تک بھی کسی نے سونے نہ دیا کوئی آٹھ بجے کے قریب چونی لال۔ دھن سیال، بوٹا سنگھ ہنستے ہوئے اور آنگن میں پھرتی ہوئی عورتوں کو تاکتے ہوئے اوپر کی منزل میں آ گئے۔

چونی لال نے آتے ہی پرکاش سے کہا۔ ”بھائی صاحب آپ نے بہت اچھا کیا آج رات کے لئے چارپائی یہاں رکھوالی۔ اب یہاں ساری رات بیٹھ کر کھڑکی میں سے نیچے آنگن کا تماشا دیکھئے۔“

پرکاش نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ ”میں سونا چاہتا ہوں۔“

بوٹا سنگھ ہنسنے لگا۔ ''سونے کے لئے آپ نے اچھی جگہ تلاش نہیں کی۔''

دھن سیال نے کہا۔ ''آج ہمارے قصبے میں دو شادیاں ہوئیں۔ آج کا دن بہت مبارک ہے۔''

پرکاش نے پوچھا۔ ''دوسری شادی کس کے ہاں ہوئی۔''

دھن سیال نے مسکرا کر کہا۔ ''اوہ ! آپ کو پتہ ہی نہیں؟...... ہاں بہت سے لوگوں کو ابھی پتہ نہیں اور آپ تو نووارد ٹھہرے۔ کل جب پرکاش وتی کی ڈولی جائے تو آپ بھی شاید ڈولی جانے کے ایک دو دن بعد چلے جائیں گے۔ آپ کو ہمارے قصبے کی شادیوں سے کیا دلچسپی؟..... لیکن میرے خیال میں آپ کو بتا دینا چاہیئے چاچا پھیرو کی شادی ہوئی ہے۔ چاچا پھیرو کو جانتے ہیں نا؟ دبلے پتلے، لمبے قد کے آدمی، وہ جو اس دن بیٹھک میں بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ میلی سی مونچھیں، کھچڑی سی داڑھی۔ رخساروں پر چھائیاں۔''

''وہ جو بازار میں حلوائی کی دوکان کرتے ہیں؟'' پرکاش نے پوچھا۔

''ہاں، ہاں، وہی جو مٹھائی بنانے کے علاوہ سوڈا واٹر بھی تیار کرتے ہیں تمباکو بھی بیچتے ہیں۔ بچارے مجرو تھے ابھی تک عمر

چالیس برس سے اوپر ہو گئی اور غریبی کی وجہ سے ہماری برادری میں کوئی انہیں رشتہ نہیں دیتا۔"

"یہ تو بہت اچھی خبر سنائی تم نے۔ چاچا پھیرو کی شادی، آج کا دن واقعی بہت مبارک ہے۔"

چونی لال، دھن سیال اور بوٹا سنگھ ایک ساتھ ہنس پڑے۔

"ہم ابھی چاچا پھیرو کو مبارکباد دیکر آ رہے ہیں۔ وہ بہت خوش تھے۔ انہوں نے داڑھی منڈوا دی ہے۔ اگرچہ مونچھیں بدستور میلی ہیں اور ہونٹوں کے کونوں میں گرتی ہیں۔ انہوں نے ہمیں تازہ مٹھائی کھلائی اور کہنے لگے۔ ابھی اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا اور ہمیں بھی تو اچانک ہی پتہ چل گیا۔"

پرکاش نے پوچھا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

چونی لال بولا۔ "ہم دریا پر گئے تھے۔ جہاں حصار کے قحط زدہ لوگ ڈیرے ڈالے پڑے ہیں۔ وہاں بہت شوروغل تھا۔ بچے بلک رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں رو رہی تھیں اور ایک بوڑھی عورت اپنے خاوند کو صلواتیں سنا رہی تھی۔ ہائے ری میری لڑیا، میری جوان اور سندر لڑیا۔ پتہ چلا کہ بوڑھے کسان کو وہ بیوقوف بوڑھی عورت اپنے خاوند کو کوس رہی ہے گویا حصار کے قحط کا ذمہ دار اس کا خاوند ہے!"

بوٹا سنگھ بولا۔ ''چاچا پھیرو بہت خوش نظر آتے تھے۔ انہوں نے اپنی دوکان میں مٹھائی کا تھالوں کے پیچھے ایک میلی سی چادر لٹکا دی ہے تا کہ پردہ رہے اور آنے جانے والوں کی نظر نہ پڑے۔''

دھن سیال نے کہا۔ ''دیکھئے بھائی صاحب، اس کا ذکر کسی سے نہ کیجئے۔ چاچا پھیرو ہم سے ساری عمر بات نہیں کریں گے اور نہ اپنی دوکان سے ہمیں مٹھائی کھلائیں گے۔ اور قصبے میں ان کے سوا یہاں کوئی دوسرا حلوائی بھی نہیں۔'' یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔

پھر چونی لال اور بوٹا سنگھ بھی اس کی ہنسی میں شریک ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے قیام و طعام کے متعلق انتظامات کی بھی دیکھ بھال کریں، بچارے کل یہاں سے رخصت ہو جائیں گے...... کہیں انہیں یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ سری پور گئے تھے اور وہاں ان کی اچھی طرح خاطر مدارات نہیں ہوئی۔''

باراتیوں کو کھانا کھلا کر کوئی دو ڈھائی گھنٹے کے بعد پرکاش فارغ ہوا اور آتے ہی چارپائی پر دراز ہو گیا۔ لیکن نیند کہاں۔ آج شادی کی رات تھی۔ ابھی ابھی ان لوگوں نے دولہا کا منہ دیکھا تھا اور بیر کی ماں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی بلائیں لی تھیں۔ ''سردارنا۔'' کیا تھا اور چاندی کی چونیاں نچھاور کی تھیں۔ عورتوں نے سہاگ کے گیت گئے تھے اور کنواری لڑکیوں کی چھاتیاں زور زور سے دھڑکنے

لگی تھیں۔ دولہا کا چہرہ پرکاش نے بھی دیکھا تھا۔ بالکل ہلدی کا یگانٹھ کی طرح تھا، وہی زردی وہی تلخی، وہی سختی اور سہرے کے زریں تاریں اور چمپا کی کلیاں بھی اس کے رنگ روپ میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرسکی تھیں۔ اس کے ساتھ اس کا بڑا بھائی بھی آیا تھا۔ اس کی ناک چپٹی تھی۔ ہونٹ موٹے، اور رخساروں کی ہڈیاں باہر نکلی ہوئیں۔ اس کے ہاتھ میں روپوں سے بھری ہوئی لال کپڑے کی ایک تھیلی تھی جسے لیکر وہ اِدھر اُدھر اس طرح گھوم رہا تھا۔ جیسے وہ اس سارے قصبے کا مالک ہو اس کے ساتھ اس کا باپ بھی تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی وہی چالاکی اور بنیا پن تھا جس کی بدولت وہ ہلدی بیچتے بیچتے لکھ پتی بن گیا تھا۔ ان کے ساتھ ان کے بہت سے رشتہ دار تھے، جن کے حُلیئے ایک دوسرے سے بہت ملتے تھے۔ کیونکہ ہلدی کی جڑ تو آخر ایک ہی ہوتی ہے۔ گانٹھیں چاہے کتنی بنتی چلی جائیں..... "ملنی" کی رسم کے وقت لڑکی والے اور لڑکے والے آپس میں بھینچ بھینچ کر گلے ملے تھے۔ چھیوروں، بھانڈوں اور میراسیوں نے بدھائی کے ترانے گئے تھے۔ اور گداگروں کے جم غفیر نے گلی کے دونوں طرف ناکہ بندی کرلی تھی، تاکہ جب فریقین کی طرف سے تانبے کے پیسے نچھاور کئے جائیں تو گلی کی سرخ اینٹوں پر پیٹ رگڑ رگڑ کر اور گندی موریوں میں ہاتھ ڈال ڈال کر انہیں لوٹا جاسکے۔

نچھاور ہوتے ہی چھوٹے بڑے گداگر سب ایک دوسرے پر پل پڑے تھے اور وہ فقیرنی جس کا چھاتیوں سے ایک سوکھا ہوا بچہ لٹک رہا تھا اور وہ بوڑھی بھکارن جس کے بال بڑ کی شاخوں کی طرح تھے۔ ایک پیسے کے لئے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوگئی تھیں۔ لڑکا چلانے لگا تھا۔ اور میراسی بدھائی کے گیت گا رہے تھے۔ کیا یہ شادی کی بدھائی تھی؟ یا سماج کے جنازے کا نوحہ یا کسی نے اپنے گھر کو آگ لگائی تھی، اور اب وہ پھڑکتے ہوئے شعلوں کو دیکھ کر خوشی سے ناچ رہا تھا...... کوئی پرکاش کے قریب بستر پر بیٹھ گیا۔ پرکاش چونک پڑا۔ یہ پرکاش وتی تھی وہ چپ چاپ آکر اس کے پاس بیٹھ گئی اور وہ دونوں نیچے آنگن میں کام کرتی ہوئی عورتوں کی طرف دیکھنے لگے۔ آنگن کے بیچ میں کاٹھ کی بیدی کھڑی کی گئی تھی۔ درمیان میں ہون کنڈ تھا۔ کاٹھ کی بیدی مندر کی طرح بنائی گئی۔ ایک چھ پہلو کی عمارت جو اوپر اٹھ کر ایک تکون کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ اسے پھولوں کے لے کے پتوں اور زریں تاروں سے سجایا گیا تھا۔ بیدی کی چوٹی پر لکڑی کے سبز رنگ کے طوطے سے لگائے گئے تھے۔ اور آنگن کی دیواروں پر ریشم سے کاڑھی ہوئے سرخ پھلکاریاں لٹکائی گئی تھیں۔ ان پر روم کے قطعے اور گائیتری اور دیگر متبرک منتر کاڑھے ہوئے تھے۔ آنگن کے آر پار جھنڈیاں لگائی گئی تھیں اور فرش پر

لکیروں والی دریاں بچھائی گئی تھیں۔ پرکاش وتی سے کہا۔ "آج تمہارا بیاہ ہے۔ دیکھو بیدی کتنی خوبصورت بنائی گئی ہے۔ بالکل مندر سے ملتی جلتی ہے، لیکن پجاری ابھی نہیں آئے اور جب پجاری آجائیں گے تو تمہیں نئے کپڑے پہن کر ایک دیوار کی طرح اپنے مندر کے دیوتا کو رجھانے کیلئے ناچنا ہوگا، اور تم تو بہت اچھا ناچ سکتی ہو، کیوں؟"

پرکاش وتی نے نمناک لہجہ میں کہا۔ "نہیں۔ میں آج ذبح کی جاؤنگی... خبر نہیں، پڑھا کر، سکھا کر ہر طرح کے عیش و آرام دیکر ہمیں ماں باپ کیوں ذبح کر ڈالتے ہیں۔ شاید یہ بھی ایک رسم ہوگی۔ لیکن میں سوچتی ہوں، کیا مجھے اسی لئے مہاودیالہ میں داخل کرایا تھا... میرا جی بھرا ہوا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ چیخیں مار مار کر روؤں... مجھے تم سے ہمدردی کی امید تھی اور تم ہو کہ جب سے آئے ہو ہر وقت جی جلاتے رہتے ہو۔"

پرکاش نے کہا۔ "بہن پرکاش وتی جی! جی جلانے کو تو ساری عمر پڑی ہے اب اگر ہنس کر بھی تم نے اپنے غم کو نہ چھپایا تو تو تمہاری شاعری کس کام کی۔"

"بھاڑ میں جائے شاعری۔" پرکاش وتی نے جھلا کر کہا۔

"وہ تو اب خود بخود چلی جائے گی۔"

پرکاش نے پرکاشوتی کا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑلیا۔ اور پھراس کی ہتھیلی پر انگلی رکھ کر بولا۔ ''تمہاری قسمت یہاں لکھی ہے۔ دیکھو یہ لکیر ظاہر کرتی ہے کہ تم بہت لمبے عرصے تک جیوگی۔ تمہارے دس بچے ہوں گے اور ایک موٹر کار یہ لکیر یہ تمہاری شاعری کی تھی۔ لیکن یہاں آکر شاعری آبگینہ ہلدی کی ایک گانٹھ سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا۔ یہ لکیر ظاہر کرتی ہے کہ تمہارے خاوند کو تم سے بہت محبت ہوگی یوں بھی تو یہ محبت دس بچوں سے صاف ظاہر ہے، لیکن ان کے علاوہ تمہیں ہر سال نئے بھدے زیور اور ریشمیں کپڑوں کے بھاری بھرکم جوڑے سلوا دیا کریگا۔ شادی کے پانچ سال بعد تم اتنی موٹی ہوجاؤ گی کہ خود تمہاری ماں بھی تمہیں پہچان نہیں سکے گی۔ اور.....''

پرکاش وتی نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے جلدی سے کہا۔ ''ہٹو بھی، ہر وقت بیہودہ مذاق، شرم نہیں آتی؟''

پرکاش نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے تیر نشانے پر بیٹھا ہے میں جانتا تھا کہ عورت ایک ہلدی بیچنے والے سے شادی کر کے خوش رہ سکتی ہے لیکن اپنے موٹاپے کا ذکر سن کر خائف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔''

یہ آخری رت جگا تھا۔ بیاہ کی رسمیں دو بجے کے بعد ادا کی جاتی تھیں، اس لئے قصبے کی سب عورتیں اپنے بہترین لباس اور زیور

پہن کر آئی تھیں۔ ڈھولک پر اتنے زور سے ہاتھ پڑتا تھا کہ پرکاش کو
اس کی دھب دھب سمع خراش معلوم ہونے لگی۔ ہر ایک عورت اپنے
گلے کی پوری قوت سے گا رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں
بیچ میں زور سے چلا اٹھتے تھے۔ نائنیں شربت پلاتی جاتی تھیں اور
دوسری منزل پر پرکاش کے قصبے کے بہت سے نوجوان لڑکے اور لڑکی
والوں کے رشتہ دار اکٹھے ہو گئے تھے اور کھڑکیوں سے جھانک
جھانک کر رت جگے کے نظارہ کر رہے تھے۔ کئی لمبی لمبی داڑھیوں
والے بزرگ بھی آ گئے تھے جو حقّہ پیتے، بار بار کھانستے اور نوجوانوں
کو شرافت کی تلقین کرتے ہوئے اپنی آنکھیں سینکتے جاتے تھے۔
پرکاش نے ان کی آنکھوں میں دبی ہوئی حسرتیں دیکھیں۔ جو اب
اپنی قبروں سے باہر جھانک رہی تھیں۔ جنہوں نے آج تک زندگی کو
گناہ سمجھا تھا اور اسے ہر جگہ اور ہر مقام پر اپنی روح کی پوری قوت
سے دبانے کی کوشش کی تھی۔ ان سے آج زندگی انتقام لے رہی تھی،
کیونکہ حس مرچکی تھی۔ لیکن حرص تیز ہو گئی تھی۔ اور حقّہ پینے والے
بزرگ اب اس راکھ کے ڈھیر کو کرید رہے تھے۔ جہاں زندگی کی ایک
چنگاری بھی باقی نہ تھی... شاید اگر بات یہیں تک رہ جاتی تو پرکاش کو
چنداں افسوس نہ ہوتا.... لیکن اسے تو رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔ ان سفید
ڈاڑھیوں والے بزرگوں پر، جن کی جوانیاں مدت سے راکھ ہو چکی

تھیں اور جواب دوسروں کی جوانیاں راکھ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔
جنہوں نے اپنی اپنی جنسی آلودگیوں پر شرافت کا پردہ ڈال لیا تھا۔ اور
اب اس جھوٹی شرافت کے بل بوتے پر اپنے جوان لڑکوں اور پوتوں
سے کھوئے ہوئے لمحوں کا انتقام لے رہے تھے۔ پرکاش نے سوچا،
کیسی بے انصافی ہے! ہم لوگ بچپن ہی میں بوڑھے کر دئے جاتے
ہیں۔ ساری زندگی روتے گذرتی ہے اور پھر وہی بسورتے ہوئے
چہرے لیکر مرگھٹ کی نذر ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس آنگن میں تو لڑکیاں
خوب زور زور سے گا رہی تھیں اور قہقہے لگا رہی تھیں۔ پرکاش کو یہ ڈر تھا
کہ ابھی کوئی بزرگ صورت آدمی کھڑکی میں سے جھانک کر کہہ دیگا۔
"لڑکیو! اتنا غل کیوں مچا رکھا ہے۔" اور رت جگے کی سب
رونق ماند پڑ جائے گی۔ اور چلاتے ہوئے گلے اس طرح خاموش
ہو کر رہ جائیں گے۔ جیسے موت کے سرد اور برفیلے ہاتھ نے انہیں
زور سے گھونٹ دیا ہو۔ بے چاری عورتوں کو تو آج ہی مدّت کے بعد
اپنے دبے ہوئے ارمانوں کو ذرا ڈھیل دینے کا موقع ملا تھا۔ وہ اس
وقت فحش لچر اور بازاری گیت گا کر بہت مسرور ہو رہی تھیں۔ گیت کیا
تھے سیدھی سادی جنسی گالیاں تھیں۔ جن میں ماں باپ، بہنوں،
بھائیوں بہوؤں اور آشناؤں کے جائز اور ناجائز تعلقات کو بڑھا
چڑھا کر بیان کیا گیا تھا۔ وہ عورتیں جنہیں پرکاش شرم وحیا کی پتلیاں

سمجھتا تھا۔ اب سب سے اونچی آواز میں سب سے گندے گیت گا رہی تھیں اور ان کے ننگے سر اور لہراتی ہوئی چوٹیاں دعوت نظارہ دے رہی تھیں۔ لیکن ایسے موقع تو بہت کم آتے ہیں۔ کبھی کبھی ہی تو کوئی شادی ہوتی ہے۔ ورنہ کئی سال گذر جاتے ہیں اور ان عورتوں پر شرم وحیا کا جھوٹا ملمع چڑھا رہتا ہے اور پھر جب وہ بوڑھی مائیں اور ساسیں بن جاتی ہیں تو اپنا سارا غصہ اپنی لڑکیوں اور بہوؤں پر اتارتی ہیں۔ یہ کرو۔ وہ نہ کرو۔ اور اس طرح اندھی سماج کا چکر زندگی کی منزل پر سے گذر جاتا ہے۔ برجندر بڑے انہماک سے کھڑکی سے نیچے دیکھ رہا تھا کہ ایک شوخ لڑکی نے اس کی طرف دیکھ کر گایا۔

ہائے برجندر وے تیری ماسی۔
اونہوں لے گیا اک سنیاسی۔
ہائے وے اک سنیاسی
ہائے وے اک سنیاسی

دھب، دھب، دھب، دھب

اور بہت سی لڑکیاں اس کی طرف دیکھ کر قہقہے لگانے لگیں اور برجندر شرما کر پیچھے ہٹ گیا۔ ایک بوڑھے بزرگ نے اسے ڈانٹ پلائی۔ تم کھڑکی میں کیوں کھڑے تھے؟ اگر گیت سننے کا ہی شوق ہے تو ادھر چارپائی پر بیٹھ کر آرام سے سنو۔ یہ بھی کیا ڈھنگ ہے اور

پرکاش نے سوچا کہ یہ بھی کیا ڈھنگ ہے کہ برجندر کی ماسی کو لیجائے اِک سنیاسی آخر اک سنیاسی کیوں؟ ایک سنار یا چمار کیوں نہیں اور پھر اسے خیال آیا کہ ہندوستانی سماج میں سنیاسی اور فقیر لوگ خاص عزت کے مالک ہیں۔ خدا کے یہ لاکھوں بندے کھاتے پیتے لوگوں سے بھیک مانگ کر ان کے ضمیر کو تسکین پہنچاتے ہیں۔ عمل اور جوتش سے ان کے مستقبل کو روشن اور دلکش بناتے ہیں۔ کایا کلپ کرتے ہیں۔ مکتی دلاتے ہیں۔ اور اولاد سے محروم بیویوں کو بچے عطا کرتے ہیں۔ مبارک ہیں ان کی زندگیاں، اور محبت سے لبریز ہیں ان کی روحیں اس لئے ماسی کا ''سنیاسی'' کے ساتھ بھاگ جانا چنداں تعجب خیز نہ تھا۔ ان فحش گیتوں میں اور عورتوں کی مسرور نگاہوں میں پرکاش کو اپنے تمدن کی ننگی روح جھلکتی ہوئی نظر آئی۔ جس چیز کو ہر بڑے اور چھوٹے فرد نے گناہ کہہ کر دل کے نہاں خانے میں چھپا دیا تھا۔ آج وہی گناہ ابل کر گانے والیوں کی آنکھوں میں جھلک رہا تھا۔ اور ڈھولک کی تال اور باریک آوازوں کی لرزتی ہوئی لے میں ظاہر ہو رہا تھا۔ اور دوسری منزل پر یہ چیزیں ایسے ایسے بزرگ بھی سن رہے تھے، جن کی طویل زندگی کا شاہکار یہ تھا کہ انہوں نے عمر بھر اپنی بیوی اور ماں کے علاوہ اور کسی عورت سے ہنس کر بات بھی نہیں کی تھی۔ اسی لئے تو ایک معصوم شاعرہ ہلدی کی ایک گانٹھ کے عوض بیچ دی گئی تھی اور

کھیتوں کی کھلی فضاؤں میں پلی ہوئی سندر لڑکیاں باسی پکوڑوں اور مٹھائیوں کی دوکان پر ایک سرسراتے ہوئے میلے پردے کے پیچھے قید کر دی گئی۔ غیر محدود تھی۔ عشق تازہ اور شباب زندہ تھا۔ لیکن تمدن بوڑھا اور عقل فرسودہ ہو چکی تھی۔ اور سماج کے نیلام گھر میں اب بھی عورتوں کو کھلے بندوں بیچا جاتا تھا۔ البتہ قانوناً غلامی ممنوع تھی۔ پرکاش نے دل میں کہا کہ وہ ایسی باتیں سوچتا سوچتا پاگل ہو جائے گا۔ بہتر یہ ہے کہ وہ سو جانے کی کوشش کرے، آنکھیں موند لے، اپنے پپوٹوں کو نیند سے بوجھل بنانے اور سرہانے پر سر ٹیک کر سو جائے اب گیت ہلکے ہو رہے تھے......دولہا بھائی سہرا باندھے ہوئے تشریف لے آئے تھے.... پرکاش وتی اور دولہا ہون کنڈ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ پنڈت مقدّس منتر پڑھ رہے تھے۔ شعلے گھی کا مزہ چکھ کر بلند ہوتے جاتے تھے.... پنڈت زور زور سے منتر پڑھ رہا تھا..... پرکاش وتی اور دولہا خوشنما اور سبک بیدی کے ارد گرد گھوم رہے تھے۔ ایک....دو....تین....چار.... پانچ.... چھ....سات....

☆☆☆

منزل

جب پرکاش چند نے آنکھ کھولی تو ابھی اندھیرا تھا۔ اگرچہ مشرقی افق پر روشنی کی ایک دھندلی سی لکیر آ گئی تھی۔ لیکن آسمان پر ستارے ابھی تک بکھرے ہوئے تھے۔ نیچے آنگن کے فرش پر بیدی کے اردگرد بہت سی عورتیں سوئی ہوئی تھیں۔ ہون کنڈ میں آگ بجھ گئی تھی اور بیدی پر لٹکے ہوئے کیلے کے پتے مرجھا گئے تھے۔ پرکاش نے چونک کر ادھر اُدھر دیکھا۔ اس کے اردگرد چارپائیوں پر گھر کے بہت سے لوگ سوئے ہوئے تھے، سوشیلا اور لیلا، ڈھولک بجاتے بجاتے تھک کر چور ہو گئی تھیں۔ بیر کا چہرہ افسردہ تھا اور لب کھلے ہوئے اور اس سے پرے پرکاش وتی ایک پچرنگی ساڑھی پہنے سو رہی تھی۔ اس کا ایک بازو چارپائی سے نیچے لٹک رہا تھا اور اسی بازو میں ہاتھی دانت کا سیندوری چوڑا چڑھا ہوا تھا۔ ماتھے پر سرخ بندی، اسے اس کے لب مسکراتے ہوئے معلوم ہوئے.... پرکاش نے آنکھیں مل کر دیکھا۔ ہاں اب تک وہ مسکرا رہی تھی۔ نئی سہاگن جو لکڑی کی بیدی پر اپنا کنوارپن لٹا چکی تھی۔ اب بھی خواب میں مسکرا رہی تھی۔ پرکاش اس مسکراہٹ کی طنز کی تاب نہ لا سکا۔

وہ آہستہ سے بستر پر سے اٹھ بیٹھا• وہ کسی کو جگانا نہ چاہتا

تھا۔ وہ ہولے ہولے سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا۔ آنگن کے فرش پر وہ نہایت احتیاط سے گذرا۔ اس کے چاروں طرف لڑکے، لڑکیوں اور عورتوں کے جسم پڑے تھے۔ کسی کے بازو ننگے کسی کی چھاتیاں۔ کسی کے بالوں کی لٹیں کھلے ہونٹوں کے کناروں پر کسی کی آنکھیں نیم وا...ان کے درمیان میں بیدی تھی۔ لیکن نہری تار اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ کیلے کے پتے مرجھا گئے تھے۔ اور ہون کنڈ کی آگ بجھ گئی تھی۔ شعلوں نے قربانی لے لی تھی اور اب وہ خاموش تھے۔ زندہ انسان کھانے والوں نے ایک زندہ روح کو نگل لیا تھا۔ اور اب مدہوش تھے۔ پرکاش نے آہستہ سے دروازہ کے کواڑ کھولے اور باہر چلا گیا۔

وہ قصبے سے باہر کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ آسمان پر ستارے بکھرے ہوئے تھے اور فرشِ زمین پر شبنم کے لاکھوں قطرے بیدار ہو رہے تھے۔ گم ہوتے ہوتے اندھیرے کی خنکی میں ایک عجیب سی تازگی تھی۔ اور جاگتی ہوئی سحر کے نور میں ایک نیا حسن۔ کیکر اور شیشم کے تنوں پر نہ دکھائی دینے والے پتے ابھی تک بیں بیں کئے جاتے تھے اور کوئی نامعلوم پرندہ کوہو۔ کوہو رٹ رہا تھا۔ بیر کی جھاڑیوں پر گھاس کے ڈنڈے ابھی تک سوئے پڑے تھے اور پتوں کے درمیان گول گول بیروں سے شبنم کے موتی اس طرح لگے ہوئے تھے گویا

مدورا کے مندر لٹکے ہوئے ہوں۔ زمین جیسے لمبے لمبے سانس لیکر بیدار ہورہی تھی۔ کھیتوں کے کناروں پر اُگی ہوئی گھاس میں ہزاروں نیلے نیلے پھول اپنی آنکھیں کھولنے لگے، پھر روشنی کی لکیر بڑھتی ہوئی دکھائی دی۔

وہ کھیتوں میں دوڑتا ہوا چلا گیا۔ اس کے پائجامے کے پائینچے اور پاؤں میں پہنے ہوئے چپل شبنم میں دھوتے گئے لیکن وہ دوڑتا ہی گیا۔ تاریکی کم ہوتی گئی اور اس نے اپنے نتھنوں میں وہ عجیب سی خوشبو محسوس کی جس سے مشرق کی ہوا بوجھل تھی۔ آج اس نے پہلی مرتبہ صبح کو جاگتے دیکھا تھا۔ ورنہ شہر میں رہتے ہوئے تو اس کی آنکھ اس وقت کھلتی تھی جب دھوپ کا پیلا پرتو کھڑکی کے شیشے سے نکل کر اس کے چہرے پر آجاتا تھا۔ لیکن آج وہ ایک غیر مرئی ہستی سے تعارف حاصل کر رہا تھا اور جب پورب کی ہوا اس کے چہرے کو چھو چھو کر گزرنے لگی تو اس نے اپنی آنکھوں اور اپنے رخساروں پر صبح کی رانی کی نازک انگلیوں کے لمس کو محسوس کیا، اس کے عطر بیز بالوں کی خوشبو کو سونگھا اور اپنے ہونٹوں پر اس کے شبنمی لبوں کی حلاوت کا مزہ چکھا اور خوشی سے بھرپور دوڑتا چلا گیا۔

زمین اسے اپنے پاس بلا رہی تھی۔ میلوں تک پھیلے ہوئے کھیتوں پر مٹی کی سوندھی لطیف اور پاکیزہ خوشبو ایک ہلکے کہرے کی

طرح چھائی تھی۔ آہستہ آہستہ درختوں کے تنوں پر سلیے اور گلہریوں کی دُمیں سرکنے لگیں اور کھیت کے کناروں کی اوٹ میں چھپتے ہوئے خرگوش بھاگنے لگے، دور ایک اونچی مینڈھ پر ایک مورنی کھڑی تھی اور مور اپنے دل کش پروں کے چھتر کو پھیلائے اس کے سامنے ناچ رہا تھا۔ ساری کائنات نغمہ ریز تھی۔ اور زمین محور گھومتی ہوئی ناچ رہی تھی۔ اس دلکش، دلفریب اور ابدی رقص کے سامنے انسانی زندگیاں اس کی مسرتیں اور غم کس قدر ہیچ تھے۔ ان کا منبع نامعلوم اور ان کی منزل ناپید...... مور کے چھتر پر مختلف رنگوں کی نازک چھلکیاں بدلتی جاتی تھیں۔ ارغوانی...... آسمانی.... دھانی، خوشیاں...... غم...... زندگیاں...... پرکاش نے سوچا یہ زمین ناچتی جائیگی، یہاں تک کہ انسانی زندگی اس کی تہذیب، تمدن اس کے دعادی باطل راکھ کا ڈھیر ہوجائیں گے۔ زمین چاند کی طرح خاموش اور مغرور ہوجائے گی۔ لیکن پھر بھی یہ زمین ناچتی جائے گی...... ہم کسقدر حقیر ہیں۔ پرکاش نے سوچا، بیر کی پتیوں پر سوئے ہوئے ٹڈوں کی طرح...... یکا یک کیکر کے ایک درخت کی چوٹی پر بیٹھا ہوا کوّا چیخ اٹھا اور ساری کائنات میں اجالا ہی اجالا ہوگیا۔ زمین کا رقص رک گیا، بنیے کی پیں پیں بند ہوگئی۔ مور اور مورنی مغرب میں آموں کے جھنڈ کی طرف پرواز کر گئے اور پرکاش کھیتوں میں دوڑتا دوڑتا رک گیا اور کہنے لگا۔

ہائے وہ صبح کی رانی کہاں گئی؟......وہ رانی جو گم ہوتے ہوئے
اندھیرے کے نازک سایوں میں شبنم کے موتی چمکاتی ہوئی آئی تھی۔
اور بڑھتے ہوئے نور سے شرما کر پھر اسی تاریکی میں گم ہو گئی.... ہائے
وہ صبح کی رانی! وہ بہت دیر تک ایک رہٹ پر نہاتا رہا۔ اس کی روح
ہلکی ہو گئی تھی۔ اور دل و دماغ ہر قسم کے خیالات سے گریزاں آم کے
درختوں پر چھوٹی چھوٹی سبز کیریاں لٹک رہی تھیں۔ اور ہرے بھرے
طوطے ٹیں ٹیں کر رہے تھے۔ بیلوں کے پیچھے بیٹھا ہوا کسان ایک
کھلونا معلوم ہو رہا تھا۔ اور بیل رہٹ کے محور کے گرد گھومتے جاتے
تھے......رُوں......رُوں......رُوں رُوں اسے ایسا محسوس ہوا جیسے
اس کے جسم کے ہر ذرے سے آواز نکل رہی
ہے......رُوں......رُوں......رُوں۔ اس بے مطلب اور بے معنی
صدا میں اسے ایک نامعلوم سی مسرّت محسوس ہونے لگی اور وہ آنکھیں
بند کر کے نہاتا گیا اور سنتا گیا......رُوں......رُوں بے مطلب، بے
معنی۔ منبع نا معلوم۔ منزل ناپید......اب وہ آنکھیں بند کئے ہوئے
بھی بیلوں کے پیچھے بیٹھے ہوئے اس کسان کو دیکھ رہا تھا جو کھلونے کی
طرح معلوم ہو رہا تھا اور بیل جو رہٹ کے محور کے گرد گھومتے جاتے
تھے......رُوں......رُوں......رُوں....

☆☆☆

گرجن کی ایک شام

عرشی اور ارضی کی بحث بہت پرانی ہے۔ وہ
ادیب جو ہر وقت آسمان پر نظر رکھتے ہیں۔ ان کی
خدمت میں صرف یہ کہنے کی جسارت کرتا ہوں کہ
ہماری زمین بھی ایک ستارہ ہے۔

(میکسم گورکی)

مدتوں سے تمہیں خط نہیں لکھ سکا۔ شاید اوشا کی فریم کاریوں کو بھولنے کی کوشش کر رہا تھا یا پھر جگدیش کی دلدوز محبت کا آخری منظر دیکھنے میں مصروف تھا۔ کچھ ٹھیک طرح سے تمہیں نہیں بتا سکتا۔ ممکن ہے کہ تم پوچھو۔ کیا جگدیش بھی محبت کر سکتا ہے۔ موٹا سا آدمی۔ گو کچھ اتنا موٹا بھی نہیں۔ لبوں پر ہر وقت مسکراہٹ شکار کا شوقین۔ برج اور بیر کا پجاری۔ کیا ایسا شخص بھی الفت کی ستمکاریوں کی تاب لا سکتا ہے۔ تو میری جان، میرے پاس اس کا جواب یہ ہے کہ...... مگر نہیں یہ بہتر ہو گا کہ پہلے میں تمہیں اس جگہ کے متعلق

بتاؤں جہاں ہم گذشتہ ڈیڑھ ماہ سے پڑے ہوئے ہیں۔ کیونکہ ماحول نہ صرف حیاتِ معاشقہ کا بلکہ ہماری تمام زندگی کا جزوِ اعظم ہے اور خاص کر محبت اور ماحول میں جو گہرا تعلق ہے۔ وہ مجنوں کی بادیہ پیمائی اور فرہاد کی کوہکنی سے صاف عیاں ہے۔ دور کیوں جاؤ۔ تمہارے وطن پنجاب ہی میں سوہنی مہیوال کا افسانہء محبت دریائے چناب کی پرشور روانیوں کا رہینِ منّت ہے اور ہیر رانجھے کا دلفریب قصہ الفت ذات پات اور قبائلی رکاوٹوں کی دیوار پر عشقِ پیچاں کی طرح آویزاں نظر آتا ہے۔ اور سچ پوچھو تو غالباً ہم کسی فردِ واحد سے محبت نہیں کرتے بلکہ اگر محبت کرتے ہیں تو صرف اپنے آپ سے دراصل انسانی محبت بذاتِ خود ایک حقیر سی شے ہے، محبت ہے کیا؟ یہی کہ دو دھڑکتے ہوئے دلوں کا سنگم، لیکن جو چیز اسے عرفانی بلندیوں پر لے جاتی ہے یا پستیوں میں گرادیتی ہے وہ اس کا ماحول ہی ہے۔ ماحول کی اہمیت سے انکار زندگی کی عظمت سے انکار ہے۔ بیچارا جگدیش بھی ایسا ہی کہا کرتا تھا۔ لیکن آج اس کی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں سے پوچھو جن کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے ہیں اور جنگلی گہرائیوں کا الم کسی بے کس زخمی، سسکتے ہوئے آہو کے درد کا آئینہ دار ہے۔

سب سے پہلی بات جو میں تمہیں اس جگہ کی بابت بتانا چاہتا ہوں وہ اس کی بلندی ہے۔ یہ جگہ سطحِ سمندر سے سترہ ہزار فٹ بلند

ہے۔ اس رفعت پر پہنچ کر انسانی محبت بھی بلند ہو جاتی ہے۔ خیالات و تاثرات میں غیر ارادی اور غیر شعوری طور پر ایک انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ دماغ پر ایک عجیب سا وجد طاری ہو جاتا ہے۔ تنفس کا دورہ تیز ہو جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کاندھوں پر سے منوں بوجھ تھا جو اٹھا گیا۔ اوپر دیکھو تو اڑنے کو جی چاہتا ہے اور نیچے دیکھو تو دور میلوں تک سلسلہ ہائے کوہ گرتے ابھرتے اور پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ چشم زدن میں نظر ان پہاڑوں اور وادیوں سے پھسلتی ہوئی نچلے میدانوں پر پڑتی ہے۔ اور نظر کا آخری نقطہ وہ ہے جہاں دریائے جہلم کا پانی چاندی کے پتلے تار کی طرح چمکتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس بلندی پر پہنچ کر آدمی سب پستیوں کو بھول جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اتنا ہی پاک وصاف سمجھتا ہے جتنی کہ یہ سپید برف جس کی آب وتاب میں موت کی خاموشی اور قدرت کی پاکیزگی پنہاں ہے۔ یہاں آ کر مجھے احساس ہوا کہ اوشا کی محبت کتنی حقیر تھی اور اس کا دائرہ کتنا محدود، یہ وہ محبت تھی جو صرف ڈرائنگ روم ہی میں کی جاسکتی ہے۔ اس استوائی پھول کی طرح جو شیشے کی دیواروں کے اندر ایک محبوس باغیچے میں کھل سکتا ہے اور مصنوعی روشنی، مصنوعی حرارت اور مصنوعی غذائیت کا محتاج ہے، ڈرائنگ روم۔ ریشمی ساریاں۔ برقی قمقمے مصنوعی چلتے ہوئے فقرے۔ میں حیران ہوں کیا واقعی مجھے اوشا

سے محبت تھی یا شاید اس غیر فطری ماحول کا اثر تھا، جو باہر کی کھلی اور خوشگوار فضا میں پہنچ کر مٹ گیا۔

یہاں بجلیاں کوندتی ہیں، بادل گرجتے ہیں، رِم جھم، رِم جھم بارش ہوتی ہے اولے پڑتے ہیں۔ برف گرتی ہے۔ پھر ہوا کے چند تیز و تند جھونکے آتے ہیں۔ اور مطلع صاف ہو جاتا ہے۔ آسمان خوشنما، نیلگوں، آفتاب سونے کے تھال کی طرح درخشاں اور پر پھیلائے ہوئے۔ ہوا میں تیرتی ہوئی چیل کسی پری کی طرح حسین نظر آتی ہے۔ ہم اپنے خیمے کا جالی دار پردہ کھولتے ہیں۔ گرم کافی کی پیالی ہاتھ میں بندوق کاندھے پر لٹکائے باہر نظر دوڑاتے ہیں۔ چاروں طرف برف ہے۔ ہوا خاموش ہے۔ آسمان صاف ہے۔ آہستہ آہستہ کافی پیتے اور چمڑے کے جوتوں کے اوپر دھان کے خوشوں سے بنے ہوئے جوتے پہن لیتے ہیں اور شکار کی تلاش میں چل پڑتے ہیں۔ یہاں شکار بہت ملتا ہے۔ جنگلی بکریاں، رونسے، اور ریچھ اور بھیڑیئے موخر الذکر بھولے بھٹکے شکاریوں کو ہی شکار کر لیتے ہیں۔ پھر رات کے وقت الاؤ کے قریب خیمہ میں بچارا چوکیدار اور اس کا جانباز کتّا آگ تاپتے ہوئے مایوسانہ نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ کالی رات میں ہوا سیٹیاں بجاتی ہے۔ بھیڑیئے چلاتے ہیں۔ پھر برف کے تودوں کے گرنے سے

ایک مہیب اور خوفناک آواز پیدا ہوتی ہے جو دُور دُور تک پھیلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے بعد خاموشی، مکمل خاموشی، موت اور سکون، شکاری نہیں آیا۔ شکاری ابھی کبھی نہیں آئے گا۔ شکار کرتے کرتے وہ خود شکار ہو گیا۔ اس کی ہڈیاں برف کے تودوں کے نیچے ہیں اور ان پر بھیڑیئے ناچ رہے ہیں۔

لیکن گھبراؤ نہیں دوست۔ ہم ابھی تک زندہ ہیں۔ صحیح و سلامت اور اب تک ایک درجن کے قریب ریچھوں، اور رونسوں، اور بھیڑیوں کو گولی کا نشانہ بنا چکے ہیں۔

جس جگہ ہمارا کیمپ ہے، اس سے کوئی ڈیڑھ پونے دو میل نیچے مغرب کی طرف گرجن کا دلکش مقام ہے، اس سے زیادہ دلکش جگہ میں آج تک کہیں نہیں دیکھی۔ یہاں سے پورے دو میل بھی نہ ہو گا۔ لیکن اف! کتنا دشوار گذار راستہ ہے اور پھر کئی جگہ اسقدر پھسلن ہے کہ اگر ذرا پاؤں اِدھر اُدھر ہونے سے توازن برقرار نہ رہا تو چلنے والا چشم زدن میں سیکڑوں فٹ نیچے برف سے اٹی ہوئی کسی کھڈ میں جا گرتا ہے۔ اب تو ہم اس راستے سے کسی قدر واقف ہو گئے ہیں لیکن پھر بھی متواتر برف و باراں سے ہر روز نیا راستہ تراشنا پڑتا ہے۔ اور پھر بھی دلجمعی سے چلتے چلتے دائیں یا بائیں نیچے نظر پڑ جائے تو ان بے پناہ گہرائیوں کو دیکھ کر سارے جسم میں بے اختیار پھریری سی

آ جاتی ہے۔

گرجن کا مقام گرمیوں میں رہنے کے لئے بہترین جگہ ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ وہ ہزاروں سیّاح جو ہر سال گلمرگ جاتے ہیں، انہیں یہ معلوم نہیں کہ گرجن گلمرگ سے کس قدر نزدیک ہے۔ گرجن میں کہیں کہیں برف کے ٹیلے ہیں تو کہیں ایسے ہموار تلّے جن پر گرمیوں میں ریشم کی طرح نرم اور ملائم گھاس اگتی ہے۔ کہیں کہیں پہاڑ کی شکنوں میں تنگ کے تناور درخت کھڑے ہیں جو برف و باراں میں محفوظ خیموں کا کام دیتے ہیں، یہاں پانچ جھیلیں ہیں۔ چھوٹی چھوٹی اور خوشنما سب سے بڑی جھیل کو نندن سر کہتے ہیں۔ یہ کوئی ڈھائی تین میل لمبی چوڑی ہوگی۔ سال میں دس مہینے یخ بستہ رہتی ہے۔ لیکن جب ہم نے اسے دیکھا تو گہرے میلے رنگ کا ایک تختہء آب بن رہی تھی، اور چاروں طرف پیلے پیلے جنگلی پھولوں سے مرصع تھی۔ یہ جھیلیں غالباً دنیا کی سب سے اونچی جھیلیوں میں سے ہونگی اور اس زمانے کی یاد دلاتی ہیں جب تمام دنیا زیرِ سطح آب تھی۔ پھر جب آہستہ آہستہ ہمالیہ کے پہاڑ نمودار ہوئے تو یہ جھیلیں وہیں پانی کے گڑھوں کے مانند رہ گئیں۔

نندر سر پر غروبِ آفتاب کا جو نظارہ ہوتا ہے۔ وہ جھیل ڈل پر میسّر ہے۔ نہ ولر پر، یہاں نہ ہوٹل ہیں نہ شکارے۔ نہ سیّاح، نہ

موٹریں، نہایت دشوار گذار راستے ہیں جو سال میں صرف تین چار ماہ کھلے رہتے ہیں۔ اور جن پر جفاکش اور خانہ بدوش گڈریئے اپنے رویوڑوں کو گرجن کے مرغزاروں میں چرانے کے لئے لاتے ہیں۔ اور اگست کے پہلے ہفتے ہی میں پھر نیچے کی آبادیوں میں چلے جاتے ہیں۔ شاذ ہی کوئی سیّاح یہاں آنکلتا ہے۔ شکار کا شوقین یا تنہائی کا دلدادہ، اور پھر اسے شاذ ہی واپس جانا نصیب ہوتا ہے پھر یہیں کہیں برف کے تودوں میں یا بھیڑیوں کے پیٹ میں، یا ان تناور تنگوں کے قریب اس کی قبر بنتی ہے۔ اس لحاظ سے گرجن کے دیوتا کو پردیسیوں، مسافروں اور سیاحوں سے بہت نفرت ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ ماسوائے، ان پہاڑی گڈریوں کے جو اسے پوجتے ہیں اور کسی کا بھی اس کے علاقے میں گزر ہو۔ گڈریئے جانتے ہیں کہ گرجن دیوتا جس پر ناراض ہوتا ہے اسے موت کی سزا دیتا ہے، اور جس پر خوش ہوتا ہے اس کی بکریوں میں دودھ زیادہ کر دیتا ہے، اس کی بھیڑوں کو نہایت خوبصورت ملایم ریشم سے ڈھک دیتا ہے۔ برف میں، جھکڑ میں، طوفان میں، ہر حالت میں اس کے ریوڑ کی حفاظت کرتا ہے۔

گرجن کی ایک دلفریب شام کا ذکر ہے، میں جگدیش اور ریوا ایک پہاڑی شکاری جسے ہم ترائی کے علاقے سے اپنے ساتھ

لائے تھے۔ شکار کھیل کر واپس کیمپ کی طرف جا رہے تھے۔ اور راستے میں نندن سر کے مقام پر بیٹھ کر ستانے لگے تھے۔ اس وقت سورج غروب ہونے کو تھا۔ ہوا میں ایسی خنکی تھی کہ ہر سانس میں برف کے لطیف گالے منہ کے اندر جاتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ گرجن کی چوٹی پر اُجلے اُجلے بادل منڈلا رہے تھے۔ بادلوں اور ڈوبتے ہوئے سورج کے عکس سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی عالیشان محل کے نیلگوں فرش پر ایک طلائی ستون کھڑا ہے اور ایک مرمریں محراب کو سہارا دے رہا ہے۔ معاً جگدیش نے پانی کی سطح پر ایک سنگریزہ پھینکا۔ ارتعاش پیدا ہوا۔ اور دوسرے لمحہ میں وہ خوبصورت محل اور طلائی ستون تھرتھرا کر لاکھوں جواہر ریزوں کی صورت میں بکھر گیا۔ اب پانی کی سطح پر لاکھوں سورج متلاطم تھے۔ جگدیش نے ہاتھ بڑھا کر اپنے قریب کے پیلے پیلے پھولوں کو توڑ کر ایک گچھا بنایا اور انہیں اپنے کوٹ پر ٹانکتے ہوئے بولا۔ ''کتنے خوبصورت پھول ہیں۔ ان کی مہک، ان کا رنگ، یہ مست کر دینے والا کیف آور تعطّر۔ ریوا ان خوبصورت پھولوں کا کیا نام ہے۔؟''

ریوا کسمسایا، وہ روئیدگی کی قسمیں پہچانتا تھا۔ ریچھوں کو دو میل کی دوری سے سونگھ لیتا تھا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں عقاب کی سی تیزی تھی۔ جو ہرن کی طرح سامنے سے اڑنے والے سہنو لے پرشست

لگانے میں بھی کبھی غلطی نہ کرتی تھی۔ لیکن وہ ان پھولوں کا نام نہ جانتا تھا۔ اچھا شکاری کبھی اچھا شاعر نہیں ہوتا۔ اس کے بھورے رخسار اور بھی بھورے ہو گئے۔ اور وہ رُک رُک کر بولا۔ ''مجھے..... پتہ۔ نہیں۔''

جگدیش کو ریوا کی بے چینی میں بہت لطف آیا۔ پھر وہ آہستہ سے بولا۔

''ٹھیک ہے ان پھولوں کے نام سے کسی کو آگاہ نہ ہونا چاہئے۔ شاید ان پھولوں کا کوئی نام ہی نہیں۔ اور یوں بھی خوبصورتی کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ حسن کی کوئی ذات نہیں۔''

میں نے مسکرا کر احتجاجاً کہا۔ ''جملہ حقوق محفوظ، تم میری باتیں دہرا رہے ہو۔''

ریوا بے چینی سے اپنی جگہ پر ہلا۔

جگدیش نے مزاحاً کہا۔ ''ہونہہ۔ جملہ حقوق محفوظ! شاید تم یہ سمجھ رہے ہو کہ تم اوشا کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہو۔ ارے بھلے مانس، یہ گرجن ہے گرجن۔''

جگدیش نے بہ مشکل یہ فقرہ زبان سے ادا کیا ہوگا کہ بادل زور سے گرجا۔ یہاں موسم کتنا غیر معین ہے۔ پل میں دھوپ، پل میں برف و باراں، ریوا نے ایک نظر بھر کر ان بادلوں کی طرف دیکھا

جواب گرجن کی چوٹی کے گرد اکٹھے ہو رہے تھے۔ اس نے نتھنے پھیلا کر شمالی ہوا کو سونگھا، اور پھر اپنے فرغل کے بٹن بند کرتے ہوئے بولا۔ ”جلدی چلو۔ طوفان آ رہا ہے۔“

ہم نے اپنی سمور کی ٹوپیاں پھولوں کے تختوں سے ڈھونڈ نکالیں اور انہیں پہن کر چل کھڑے ہوئے۔ اگرچہ ابھی دھوپ چمک رہی تھی۔ لیکن کئی جگہوں پر پہاڑوں اور گھاٹیوں کے مختلف حصّوں پر سفید بادل اپنا سایہ ڈال رہے تھے۔ ہوا کی خنکی ہر لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔ اور ہمیں تو ابھی بہت اوپر اپنے کیمپ تک پہنچنا تھا۔ ہم جلد جلد لیکن نہایت خاموشی سے راستے پر چڑھتے جاتے تھے۔ گرجن کی چوٹی پر سے بادل نیچے کی طرف پھسل رہے تھے۔ ایک ہلکا سا جھکڑ چلنے لگا تھا اور کہیں کہیں روئیں جیسی پتلی اور ہلکی دھند ہمارے راستہ میں آ جاتی تھی۔ ہم نے اپنی رفتار اور تیز کر دی، لیکن کوئی پون گھنٹہ کے سفر کے بعد طوفان نے ہمیں آ ہی لیا۔ ہلکی ہلکی بارش، اور پھر کر یئڑی اور اس کے ساتھ فوراً ہی برف گرنی شروع ہوئی ریوا سب سے آگے تھا۔ درمیان میں جگدیش، اور آخر میں میں، ہم تینوں کی کمر میں ایک ہی رسی بندھی ہوئی تھی۔ ریوا ہمارا رہنما تھا۔ پندرہ۔ بیس منٹ اور چلے۔ یکا یک میری کمر کو ایک سخت جھٹکا لگا۔ بہت سخت، اتنا سخت کہ اگر میرے حواس بجا نہ ہوتے اور برچھا میرے پاس نہ ہوتا تو

میں یقیناً اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکتا۔ اب میں برچھے کے سہارے کھڑا زور لگا رہا تھا۔ کیونکہ رسّا بائیں طرف جھکا ہوا تھا۔ چاروں طرف دھند چھا گئی تھی۔

اوپر سے دیوا کی آواز آئی۔ ''سنبھل جاؤ۔ سنبھل جاؤ۔''

''کیا ہوا؟'' میں نے چلا کر کہا۔

جگدیش کی آواز آئی۔ ''میں برف پر گر گیا ہوں۔ اُف کتنا درد ہے اٹھا نہیں جاتا۔ پاؤں میں ضرب آ گئی ہے۔''

''اٹھو، اٹھو، کوشش کرو۔'' میں نے رسّی پر زور لگاتے ہوئے کہا۔

طوفان نے ہمیں گھیر لیا تھا۔ دھند سفید تھی۔ لیکن تاریکی سے بھی بدتر، میرے اور دیوا کے درمیان جگدیش کہیں بیچ برف پر گرا ہوا تھا اور ہم اسے اٹھا نہ سکتے تھے۔

ریوا کی آواز آئی۔ ''توازن ٹھیک رکھو۔ رسی کو دائیں طرف جھٹکا دو، ایک.... دو.... تین۔''

بڑا زور لگایا۔ لیکن جگدیش اٹھ نہ سکا۔

آخر رسی کو بل دیتے ہوئے اور برچھے سے کچی گرہیں باندھتے ہوئے میں ریوا اور جگدیش تینوں ایک مقام پر جمع ہو گئے۔ میں نیچے سے چل کر اوپر جگدیش گھٹنوں کے بل پڑا ہوا کراہ رہا تھا۔

''کیا ہوا جگدیش۔'' میں نے جھک کر جگدیش کو اٹھاتے

ہوئے پوچھا۔

جگدیش سہارا لیکر اٹھ کھڑا ہوا، مگر پھر فوراً برف پر بیٹھ گیا۔

''مجھ سے تو اب چلا بھی نہ جائیگا۔ پاؤں میں ضرب آئی ہے۔''

چاروں طرف سفید دھند چھا گئی تھی۔ ہوا میں ایک وحشیانہ تیزی تھی۔ برف خاموشی سے گر رہی تھی۔

''ہُو.....ہُوآ......آ آ آہُو.....ہُوا.... آ آ آ......ہُو۔''

ریوا نے دوبارہ سیٹی بجائی سیٹی کی تیز آواز کسی نوکدار خنجر کی دھار کی طرح تلملاتی ہوئی، طوفان کو چیرتی ہوئی گزر گئی۔ اور پھر چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔

''ہُوآ...... آ......آہُو، ہُوآ.....آ.... آ.....آ.....ہُو۔'' ریوا نے چند لمحوں کے بعد پھر سیٹی بجائی۔ کہیں سے کوئی جواب نہ آیا۔

ریوا نے ایک متعیّن وقفے کے بعد پھر سیٹی بجائی اور ہم تینوں دھڑکتے ہوئے دلوں سے اس کے جواب کے منتظر رہے۔ لیکن کانوں میں صرف بڑھتے ہوئے طوفان کے وحشیانہ قہقہے تھے۔ سردی دم بدم بڑھ رہی تھی۔ ہاتھ پاؤں سُن ہو رہے تھے۔ آنکھوں میں نیند آ رہی تھی۔

''مت سوؤ۔ جگدیش مت سوؤ۔'' ریوا نے سیٹیوں کے درمیان کے وقفے میں کہا۔

میری آنکھوں میں ایک عجیب سا خمار چھا رہا تھا۔ پپوٹے بند ہوئے جاتے تھے۔ جانتا تھا کہ مجھے سونا نہیں چاہئے۔ جانتا تھا کہ یہ خمار موت کا خمار ہے یہ نیند ہے۔ آخراور کبھی نہ ختم ہونے والی نیند پھر بھی آنکھیں جھپک جھپک جاتی تھیں اور جگدیش بچارا تو بالکل اونگھ رہا تھا۔

ریوا نے ہم دونوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''میری بات سنو، میری بات سنو، دیکھو دیکھو، میری طرف دیکھو، اپنی مٹھیوں میں برف بھینچ لو۔ زور سے زور لگاؤ۔ اور زور لگاؤ... اور......''

''ہُوآ آ آ......ہو......ہوآ آ آ.....ہو'' دور نیچے سے کسی مدھم سیٹی کی آواز سنائی دی۔ ریوا نے جواب میں سیٹی بجائی۔ سیٹی کی آواز، ایسا معلوم ہوا کہ دور دور پھیلتی جارہی ہے۔ اور خطرے کا سگنل دے رہی ہے۔ امداد کے لئے پکار رہی ہے۔ اس سیٹی میں کتنا خوف تھا۔ کتنی التجا، کتنا درد، کتنی امید، ہمارے کان اس کے جواب کی طرف لگ گئے۔ کیا سچ مچ سیٹی کا جواب آیا تھا۔ کیا یہ محض ایک واہمہ تو نہ تھا۔

مگر نہیں دور نیچے کہیں سے پھر سیٹی کی آواز سنائی دی، مدھم، میٹھی۔ امید دلانیوالی اس برفانی طوفان میں وہ سیٹی روشنی کے مینار کی طرح چمک اٹھی۔

قدرے توقف کے بعد ریوا نے پھر سیٹی بجائی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد اس کا جواب آیا۔ ایک سیٹی کہہ رہی تھی۔ ''ہم یہاں بیٹھے

ہیں۔طوفان میں گھرے ہوئے ہیں۔'' دوسری کہہ رہی تھی۔''گھبراؤ نہیں۔ہم آرہے ہیں۔'' دوسری سیٹی نزدیک آتے آتے پھر دُور ہو جاتی۔شاید راستہ سے پرے ہٹنا پڑا ہوگا۔اس طرح ایک گھنٹہ گزر گیا۔آدھ گھنٹہ اور اب ہمارے سامنے ایک جفاکش ادھیڑ کا پہاڑی کھڑا تھا۔اس کی چھاتی پر ایک لالٹین بندھی تھی۔جس کی مدھم روشنی اس تاریک دھند کو چیرتی ہوئی بمشکل ایک دو گز دور جاتی تھی۔اس کے ساتھ ہی ایک چھریرے بدن کا جوان کھڑا تھا۔لیکن دھند میں ان کی صورتیں اچھی طرح پہچانی نہ جاتی تھیں بس سائے سے معلوم ہوتے تھے۔

جفاکش پہاڑی نے پوچھا۔''کیا بات ہے،طوفان میں کیسے گھر گئے؟''

ریوا نے جواب دیا۔''ہمارے ساتھی کو چوٹ آگئی اور...''اس نے فقرہ ناتمام رہنے دیا۔

جفاکش پہاڑی چند منٹ تک چپ رہا۔اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

چند منٹ آرام کے بعد پہاڑی نے چھریرے بدن کے جوان کو جگدیش کی طرف اشارہ کر کے کہا۔''اسے اٹھالو۔میں بمشکل راستے کی رہنمائی کر سکوں گا۔''

چھریرے سائے نے چند لمحوں کے لئے توقف کیا۔ پر وہ جھکا اور اپنے مضبوط ہاتھوں سے جگدیش کو اٹھا کر اپنی پشت پر گردن کے قریب رکھ لیا۔ دوسرے پہاڑی نے ایک رسی سے جگدیش کی ٹانگیں اس کی کمر سے باندھ دیں پھر ایک رسّا اپنی کمر سے باندھ کر اس جوان کی کمر کے گرد لپیٹا۔ پھر وہ رسا مجھ تک پہنچا، میں نے اسے کمر میں باندھ کر ریوا کے حوالے کیا۔ آخر میں ریوا نے اسے مضبوطی سے اپنی کمر میں باندھ لیا۔

"تیّار ہو۔" پہاڑی نے ہمیں چوکنا کرتے ہوئے کہا۔ "برچھے مضبوطی سے تھامو۔ ایک...... دو......... تین۔" اور اس طرح رات کی تاریکی میں، برف کے خطرناک سمندر میں یہ کارواں ازسرِ نو گرجن کو چلا۔

پہاڑی کا گھر ایک تنگ کے نیچے تھا۔ وہاں پہنچکر اس نے جلدی سے دو تین کھالیں نکالیں اور زمین پر بچھائیں اور دوسرے پہاڑی نے جگدیش کو وہاں لٹا دیا۔ جگدیش بیہوش تھا۔ یا شاید برف کی نیند سو رہا تھا۔ ادھیڑ عمر کا پہاڑی تنے کی کوکھ کے اندر گیا۔ اور وہاں سے اپنی مٹھی میں ایک گول مڑی ہوئی چمڑے کی تھیلی سی باہر لایا۔ الاؤ کی سرخ روشنی میں میں نے دیکھا۔ یہ ایک نافہ تھا۔

"ذی شی لالٹین بجھا دو۔" پہاڑی نے اپنے ساتھی سے کہا۔

جواب ایک طرف اندھیرے میں بیٹھا ہوا سستا رہا تھا۔ اندھیرے میں ایک لمبے سانس کی آواز سنائی دی اور پہاڑی کا ساتھی الاؤ کی طرف بڑھا۔ اسے تاریکی سے روشنی میں آتے ہوئے میں نے دیکھا کہ وہ ایک جوان لڑکی تھی۔ اب اس نے اپنی سمور کی ٹوپی اتار پھینکی تھی جس نے اس کے لمبے بالوں کو چھپا رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں تکان سے نیم وا تھیں اور جبیں پسینے سے تر تھی۔ اپنے مضبوط ہاتھوں سے اس نے پہاڑی کی کمر سے لالٹین کو کھولا۔ اور ایک پھونک مار کر اسے بجھا دیا۔ پھر لالٹین ہاتھ میں لیکر سر کو ایک طرف جھکائے ہوئے واپس اندھیرے میں چلی گئی۔

پہاڑی گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ اور جگدلیش کے تنفس پر غور کرنے لگا۔ کچھ عرصے کے بعد اس نے لکڑی کے بڑے چمچے میں تھوڑا سا گرم دودھ اور نافہ ڈال کر ہلایا اور اسے جگدلیش کے منہ میں انڈیل دیا۔ ایک اور چمچے میں اس نے کوئی اور چیز گرم کی جو غالباً کسی جانور کی چربی معلوم ہوتی تھی۔ اور بہت بدبودار تھی۔ جب وہ چربی بھی گرم ہو کر سیال بن گئی تو اس میں بھی اس نے تھوڑا سا نافہ ڈال دیا اور اسے انگلی سے ہلاتے ہوئے ذی شی کو پکارا۔

"کیوں کیا بات ہے؟" ذی شی نے وہیں اندھیرے میں بیٹھے ہوئے جواب دیا۔ اس کی آواز سُست اور مضمحل تھی۔

''ادھر آنا بیٹا۔ ذرا ان کی کنپٹیوں کو آہستہ آہستہ سہلاؤ۔ یہ لو روغن۔''

ذی شی نے جگدیش کا کن ٹوپ اتار لیا۔ اور اس کا سر اپنی گود میں لیکر اس کی کنپٹیوں کو آہستہ آہستہ سہلانے لگی، پہاڑی تنے کا سہارا لیکر بیٹھ گیا۔ الاؤ کے سرخ ہالے میں پہاڑی کا شکن آلود چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ تھوڑی کسی قدر مضبوط تھی۔ اور گردن کی رگیں باہر کو تنی ہوئی تھیں۔ جگدیش کا سانس کبھی دھیما ہو جاتا۔ کبھی تیز چلنے لگتا، کبھی اس میں گرر گرر کی سی آواز پیدا ہوتی جیسے کسی گھڑی کو چابی دیتے وقت سنائی دیتی ہے......لڑکی دھیرے دھیرے کنپٹیاں سہلا رہی تھی۔ اس کے سہلانے سے چڑ چڑ چڑ کی ایک عجیب خواب آور سی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ میں ادھ مندی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ جگدیش پر اس طرح جھکی ہوتی تھی کہ اس کا آدھا چہرہ اندھیرے میں تھا اور آدھا الاؤ کے ہالے میں، میں اس کا چہرہ صاف دیکھ سکتا تھا۔ یہ آرین اور منگول خطوط کا ایک حسین مرقع تھا۔ زعفران اور گلاب کے رنگوں کا ایک دلربا امتزاج۔ اس کے غلافی پپوٹے اس طرح جھکے ہوئے تھے کہ آنکھیں بالکل بند معلوم ہوتی تھیں۔ ذی شی......معاً میرے دل میں خیال آیا کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں یہ ایک خواب ہے یہ جوان لڑکی، یہ پہاڑی بونا، یہ تنگ کا تنا۔ یہ سرخ

الاؤ۔ یہ سب کچھ ایک طویل خواب ہے۔ شاید میں اوشا کے بیٹھنے کے کمرے میں صوفے پر لیٹا ہوا اس سپنے کو دیکھ رہا ہوں۔ اور وہ ابھی ابھی ایک نیلی ساڑھی پہن کر اندر آئے گی اور مجھے سوتا دیکھ کر اپنی تحقیر آمیز ہنسی سے مجھے جگا دے گی۔ اٹھو بے فکرا لو۔ ساڑھے پانچ بج گئے۔ ایڈی کنٹر کا حکم........میں نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔

قدرے توقف کے بعد میں نے پھر آنکھیں کھولیں تو وہی منظر تھا وہی پہاڑی بونا درخت سے پیٹھ لگائے بیٹھا بیٹھا سو گیا تھا۔ لڑکی جگدیش کا سر سہلا رہی تھی۔ جگدیش کا تنفس اب صاف چل رہا تھا۔ الاؤ کا ہالہ تنگ ہو گیا تھا۔ اونگھتے جاگتے، پلکیں جھپکتے جھپکتے اس خوبصورت کو دیکھتے دیکھتے آہستہ آہستہ یہ سارا منظر ایک سکوں ریز دھند لکے میں غائب ہو گیا۔

جب دوسرے دن آنکھ کھلی تو نہ جگدیش تھا، نہ وہ جوان لڑکی۔ پہاڑی بونا بھی غائب تھا۔ میں اکیلا تنگ کے وسیع سائے میں لیٹا ہوا تھا کچھ دیر دل میں یہ خیال جاگزیں رہا کہ کل جو کچھ دیکھا تھا محض ایک افسانہ تھا، آنکھیں ملتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پہلے تنے کی کوکھ نظر آئی، پھر دُور پرے دھوپ میں ایک ریوڑ چرتا ہوا نظر آیا۔ ڈھارس بندھی، زور سے آواز دی۔

”جگدیش......او جگدیش۔“

ریوڑ میں سے دوایک بکریوں نے منہ اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

یکا یک تنے کی کوکھ سے پہاڑی مسکراتا ہوا نکلا۔ ”گرجن دیوتا کی مہربانی سے کل آپ کی جان بچ گئی۔“

میں اٹھ کر بیٹھ گیا، اور پہاڑی کی طرف تکتے ہوئے کہنے لگا۔ ”شکریہ تمہارا اور تمہاری بہادر لڑکی کا ہزار بار شکریہ۔“

”کیا نام ہے اس کا؟ ذی شو۔؟“

”ہاں، ذی شی، اس کا نام ہے۔ میری ننھی ذی شی بہت اچھی لڑکی ہے۔ گرجن دیوتا اس سے بہت محبت کرتے ہیں۔ وہ سب برفیلے راستوں سے واقف ہے اسے گرجن دیوتا کبھی کوئی گزند نہیں پہنچنے دیتے۔ چھوٹی عمر ہی میں اس کی ماں مرگئی تھی۔ گرجن دیوتا ہی نے پالا ہے۔ گرجن دیوتا ذی شی سے بہت محبّت کرتے ہیں۔“

ایک گرجن دیوتا پر ہی کیا موقوف ہے۔ میں نے دل میں سوچا۔ اس سے تو ہر کسی کا دل محبت کرنے کو چاہتا ہے۔ میں نے پہاڑی بونے سے پوچھا۔ ”جگدیش کہاں ہے؟“

پہاڑی نے جواب دیا صبح جب ان کی آنکھ کھلی تو پاؤں کی موچ بالکل نکل چکی تھی۔ اب ذرا نندن سر تک سیر کرنے کو گئے ہیں۔ ذی شی کو میں نے ان کے ساتھ بھیج دیا تھا۔ وہ دونوں اب واپس آتے ہی ہوں گے۔ آپ تو خوب سوئے۔“

ہاں میں تو خوب سویا۔ میں نے دل میں سوچا۔ کیونکہ رات بھر کسی نے میری کنپٹیوں پر مالش نہیں کی۔ وہ دونوں؟ یہ لفظ سن کر میرے دل میں ایک نامعلوم سی خلش پیدا ہوتی۔ ایک خفیف سا انتشار، کمبخت جگدیش ہر بار بازی لے جاتا ہے۔ میں نے پہاڑی سے آہستہ سے پوچھا۔ ''نندن سر یہاں سے کتنی دور ہے؟''

''یہی کوئی کوس بھر۔ سیدھے اس طرف وہ!''

''اچھا میں بھی نہا دھو آؤں۔'' بوڑھے سے یہ کہہ کر میں چلتا بنا۔ میں چل رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ جگدیش نہ تو لارڈ بائرن کی طرح لنگڑا ہے اور نہ ڈان جوان کی طرح حسین پھر بھی یہ کمبخت عورتیں کیوں اس پر اتنی جلدی فدا ہو جاتی ہیں۔ کیا اس دنیا میں ہم ہی مہاتما گاندھی رہ گئے ہیں۔ آخر ہمارے پہلو میں بھی ایک حساس دل ہے۔ سوز، تڑپ، شعریت سب کچھ ہے۔ مگر اس پر بھی سب ہمیں ایک گھن چکر سمجھتے ہیں۔ آخر یہ تفاوت کیوں؟ جگدیش میں ایسے کون سے لعل لگے ہیں۔ موٹی موٹی آنکھوں پر عینک جما کر مرغے کی طرح چھاتی نکال کر چلنے سے کون سے سرخاب کے پر لگ جاتے ہیں۔ وہ چڑیل اوشا بھی اس پر مرتی تھی۔ کمبخت، یونہی سوچتے سوچتے، دل ہی دل میں کڑھتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ یکایک سامنے سے ایک دلکش ہنسی اور پھر ایک بلند قہقہے کی آواز سنائی دی آنکھ اٹھا کر

دیکھا تو سامنے کے ٹیلے پر سے جگدیش اور ذی شی چلے آ رہے تھے۔ دونوں نے لمبے سموری فرغل پہن رکھے تھے۔ دونوں کے سروں پر سموری ٹوپیاں تھیں۔ جن پر ایک طرف کو پیلے پیلے پھولوں کے گچھے بندھے تھے۔ جگدیش کا بلند قہقہہ مجھے بہت نا گوار گذرا۔

''اتنی دیر سوئے رہے؟'' جگدیش نے سوال کیا، سوال کیا تھا۔ سراسر تضحیک تھی۔

''اتنی جلدی جاگ اٹھے؟'' میں نے جواب دیا۔ جواب کیا تھا سراسر طنز تھی۔

''نہانے چلے ہو؟'' جگدیش نے پوچھا۔

''پاؤں کی موچ نکل گئی ہے کیا؟'' میں نے جواب دیا۔

ذی شی نے ایک دلکش قہقہہ لگایا، اور اپنا بایاں بازو میرے بازو میں ڈال کر کہنے لگی۔ ''آؤ ہم تینوں واپس نندر سر کو چلیں۔'' جب ہم نندن سر کو چلے تو جگدیش اپنی عینک صاف کر رہا تھا اور میں دل میں کہہ رہا تھا کہ اے پُرفن حسینہ تو نے اس وقت تو ہم دونوں کو خوش کر دیا لیکن جلد یا بدیر تجھے اس امر کا فیصلہ کرنا ہوگا کہ تو دونوں میں سے کس کو چاہتی ہے؟

اور جلدی اس امر کا فیصلہ ہو گیا، میں نندن سر پر نہاتا رہا اور وہ دونوں پھولوں کے تختوں میں نیم پنہاں خدا جانے کیا باتیں کرتے

رہے، کبھی کبھی ہنس پڑتے پھر کان ہی کان میں ایک دوسرے کو کچھ کہتے ، ایک دوسرے کی طرف پھول توڑ توڑ کر پھینکتے جگدیش نے خدا جانے اسے کیا کہا ذی شی یکا یک بھاگ اٹھی ۔ جنگل کی مست ہرنی کی طرح، جگدیش اس کے پیچھے اٹھ کر دوڑنے لگا۔ ہاں واقعی پاؤں کی موچ نکل چکی تھی ۔ پھولوں کے تختوں میں اس نے کئی چکر کھائے ۔ مگر ذی شی کہاں اس کے قابو میں آئی تھی ۔ اور اس کے لمبے لمبے سیاہ بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ وہ بھاگتی ہوئی پھولوں کے تختوں سے پرے ٹیلوں پر سے چھلانگیں لگاتی ہوئی دور نکل کر نظر سے اوجھل ہو گئی ۔ جگدیش بھی بھاگتا نظروں سے غائب ہو گیا۔ اب میرے سامنے صرف سمور کی دو ٹوپیاں پڑی تھیں اور پھولوں کے مسلے ہوئے تختے۔ یخ کی طرح سرد پانی نے جسم اکڑا دیا تھا اور ہونٹ نیلے کر دیئے تھے۔ میں نہا کر بہت دیر تک دھوپ تاپتا رہا۔ آج گرجن دیوتا کی چوٹی پر بادلوں کا نشان بھی نہ تھا۔ میں پہاڑ پر اس سلوٹ کو ڈھونڈنے لگا جس کے اندر خیمہ تھا۔ لیکن وہ سلوٹ یہاں سے نظر نہ آتی تھی ۔ جگدیش اور ذی شی کہاں گئے ۔ یہ سوچکر میرا منہ لال ہو گیا۔ اب تو گرجن کو ہی اپنی قیام گاہ بنانا ہوگا۔ آج ریوا کو کہنا ہوگا۔ مزدوروں کو ساتھ لیکر جائے اور خیمہ اور دیگر سامان اٹھوا کر یہاں لے آئے ۔ اس برفانی سلوٹ سے یہ تنگ کی پستی زیادہ محفوظ جگہ ہے اور

اگر کل کی طرح ایک اور ایسی ہی برفانی اور طوفانی شام آ گئی تو گرجن دیوتا کی بددعا پوری ہو جائے گی۔

اب بدن اچھی طرح سے گرم ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں غنودگی سی آنے لگی تھی۔ دماغ میں جیسے شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ میں نے اٹھ کر کپڑے پہنے اور چلنے لگا۔ راستے میں پھر مجھے جگدیش اور ذی شی مل گئے۔ ذی شی کے رخساروں کی لالی بڑھ گئی تھی۔ اس کی آنکھیں نیچی تھیں۔ جگدیش کی چھاتی ضرورت سے زیادہ باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ ایک نئے بھرتی شدہ لفٹننٹ کی طرح اس بار ذی شی نے چلتے چلتے میرا ہاتھ نہیں پکڑا۔ میں نے اپنے دل کو سمجھایا۔ بیٹا صبر کرو۔ رونے دھونے سے کیا ہوتا ہے۔ ایسے کئی چرکے تم کھا چکے ہو۔

گرجن میں زندگی ایک سپنے کی طرح گذرتی ہے۔ اس سپنے میں ریشمیں گھاس کے بے شمار قطعے ہیں۔ ان قطعوں کے اندر کہیں کہیں تنگ کے درخت ہیں۔ ان تنگ کے درختوں کے نیچے گڈریئے اور ان کے ریوڑ رہتے ہیں۔ دن بھر ریوڑ سبزے کے قطعوں میں گھاس چرتے ہیں۔ کودتے ہیں، ناچتے ہیں، میں میں بابا کرتے ہیں۔ کبھی ناکام رہتے ہیں تو ایک دوسرے کو سینگ مار مار کر لہولہان کر دیتے ہیں۔ گڈریئے مینڈھوں کو لڑاتے ہیں۔ شرطیں بدتے ہیں۔ ہارتے ہیں۔ جیتتے ہیں الغوزے بجاتے ہیں۔ شکنجہ کھیلتے

ہیں۔ پھر جب شام ہو جاتی ہے اور مغربی افق کی آخری لال دھاری تاریکی میں گم ہونے لگتی ہے تو ریوڑوں کو واپس تنگ کے درختوں تلے لے آتے ہیں۔ الاؤ کے ارد گرد بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ کھانے میں دودھ شامل ہوتا ہے اور مکھن اور مکئی کی روٹی کبھی نمک یا گڑ یا نیچے کی بستیوں سے کبھی کبھی پیاز اور سرخ مرچیں بھی آ جاتی ہیں۔ ورنہ اکثر وہی دودھ اور مکئی کی روٹی وہی اور مکھن، پنیر، گرجن میں ہر چرواہے اور چرواہی سے کے جسم سے پنیر کی سوندھی سوندھی بو آتی ہے۔ جو اکثر شہری طبیعتوں کو بہت بری معلوم ہو گی۔ پسند اپنی اپنی، غازہ اور پوڈر اور لپ سٹک کی جگہ چرواہیاں یہی دودھ مکھن استعمال کرتی ہیں۔ تیل کی جگہ بھی مکھن یہاں مٹی کے برتن بہت کم ہوتے ہیں۔ دودھ کی کھالوں میں دودھ کر رکھا جاتا ہے۔ دودھ دوہتے وقت چرواہیاں شرطیں بدتی ہیں۔ کس کی بکری زیادہ دودھ دیتی ہے۔ کون زیادہ دودھ کی دھاریں اپنے منہ میں ڈال سکتی ہے۔ نیم گرم دودھ کی تازہ دھاریں جب پیاسی زبان سے جا لگتی ہیں تو دل کو وہ فرحت نصیب ہوتی ہے کہ چائے اور کوکو، سب بھول جاتے ہیں۔ میرے خیال میں زندگی کا بہترین مصرف یہ ہے کہ آدمی بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک تنگ کے درخت کے تلے رہے۔ بکریاں چرائے۔ الغوزے بجائے اور تازے دودھ کی دھاروں سے شام جان کو ہر دم

تازہ رکھے۔ دودھ سے مکھن نکالنے کا طریقہ بھی بہت عجیب ہے۔ یہاں نہ مٹی کی مٹکی ہے۔ نہ بلونا۔ بس ایک کھال میں اس کے نصف حجم کے برابر دودھ ڈال دیا جاتا ہے۔ اور ایک چرواہی اس کھال کو اچھی طرح سے بند کر کے ایک پھکنے کی طرح گھاس پر لٹا دیتی ہے۔ اور پھر جس طرح آٹا گوندھا جاتا ہے اس طرح کھال کو اپنے ہاتھوں سے باربار گھوندھتی ہے۔ لٹیں بکھری ہوئی ہیں۔ چہرہ لال ہے۔ آنکھوں میں چمک ہے۔ زبان پر کوئی پہاڑی گیت ہے اور کھال گوندھے جارہی ہے۔ کوئی ایک آدھ گھنٹہ کے بعد کھال کے اندر دودھ اور مکھن الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ دودھ الگ دوسری کھال میں ڈال لیا جاتا ہے۔ اور مکھن ہاتھ سے اتار لیا جاتا ہے۔ دودھ خالص بھی ہوتا ہے اور گاڑھا بھی۔ اس دودھ میں پانی کم اور مکھن زیادہ ہوتا ہے اور جب پیو تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا شیریں مکھن کا سیال ہے کہ گلے میں اترتا جارہا ہے۔ اس دودھ کو پی کر نیند بہت آتی ہے۔ ساری زندگی ایک سپنا معلوم ہوتی ہے اور دراصل گرجن ہے بھی ایک سپنا ہی۔ ورنہ ایسے ایسے مقام تو اب ناپید ہوتے جارہے ہیں۔ اب تو دنیا تلخ حقیقتوں سے بھری جارہی ہے۔ نقلی دودھ اور نقلی محبت اور نقلی انسانیت اور پھر زندگی کارخانے سے گھر کے گندے صحن میں اور گندے صحن سے کارخانے کے گندے ورکشاپ تک محدود

رہتی ہے۔ اس زندگی میں بچے پیدا ہوتے ہی بوڑھوں کی سی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ لیکن گرجن میں ابھی تک ہر بوڑھا اور نوجوان بچپن کی معصومیت لئے ہوئے ہے۔ الاؤ کے چٹختے ہوئے کوئلوں کی مدھم روشنی میں چرواہیاں اون سے کچھ بن رہی ہیں۔ تکلی گھوم رہی ہے، ان کی باہیں اور چہرے اور آنکھیں ایک خاص ترتیب سے حرکت کرتی ہیں، جیسے یہ مکھن کی پتلیاں ہیں۔ ایک چرواہا کہانی سنا رہا ہے۔ ریمی کی کہانی تم نے سنی ہے۔ ریمی گرجن کی سب سے حسین لڑکی تھی۔ وہ تنگوں کے سایوں میں پل کر جوان ہوئی تھی اور نندن سر کی نیلی جھیل کا عکس اس کی دلکش آنکھوں میں چمکتا تھا۔ اس کی جبیں گرجن کی برف کی طرح سپید تھی۔ اور ڈوبتے ہوئے سورج نے اس کے گالوں کو چوم کر انہیں ایک جاودانی چمک عطا کی تھی۔ ایسی لڑکی کسی دیوتا ہی سے بیاہنے کے لائق تھی۔ کسی چرواہے کو اس سے محبت کرنے کی جرات نہ ہونی چاہئے تھی۔ گرجن دیوتا کا سایہ اس پر تھا۔ وہ اکثر دن بھر اکیلی گھومتی تھی۔ کبھی کبھی وہ بے خوف وخطر گرجن کی سب سے اونچی چوٹی پر چلی جاتی۔ شاید اس نے دیوتا کے درشن کر لئے تھے۔ وہ اپنے ماں باپ کو بہت پیاری لگتی۔ لیکن افسوس وہ جان بوجھ کر موت کے منہ میں جا رہی تھی۔ اسے کئی بار سمجھدار بوڑھے چرواہوں نے سمجھایا۔ لیکن وہ نہ مانی۔ گرجن دیوتا نے بھی اسے کئی بار

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

سمجھایا۔ کہانی سنانے والے چرواہے کو معلوم تھا کہ ایک بار واٹو کو لک سر کی گھاٹی میں گرجن دیوتا ملے تھے۔ چاندنی رات تھی اور گھاٹیاں اور چوٹیاں اور میدان ایک روپہلی خاموشی میں کھوئے ہوئے تھے۔ نہ ہوا تھی، نہ نغمہ، نہ بادل اور اس خاموش بے حس و حرکت کائنات میں صرف دو دل دھڑک رہے تھے۔ ریمی اور واٹو۔ واٹو اور ریمی اور واٹو نے جرات کر کے ریمی کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ عین اسی وقت واٹو کو سامنے ایک سپید برف کا گولا ہوا میں اڑتا ہوا نظر آیا۔ اس نے گھبرا کر ریمی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ گولا ہوا میں اڑتا ہوا آسمان کی طرف پرواز کرنے لگا۔ اور پھر اس کے سامنے زمین سے آسمان تک برف کی ایک لکیر سی کھنچ گئی تھی۔ ریمی کی آنکھیں بند تھیں اور چہرہ سپید۔ اور واٹو اس لکیر کو دیکھ کر کانپنے لگا۔ لیکن وہ ریمی کی محبت سے دست بردار نہ ہوا۔ گرجن دیوتا نے اسے ایک بار پھر سرزنش کی۔ کہانی سنانے والے چرواہے کو معلوم تھا کہ کس طرح واٹو کو گرجن دیوتا نے رات بھر طوفان میں گھیرے رکھا تھا۔ واٹو کو اس بھیانک رات میں کبھی کبھی گرجن دیوتا کی خشمگیں آواز سنائی دیتی۔ ''ریمی کی محبت سے باز آ، ریمی تیری نہیں ہو سکتی۔'' کبھی کبھی اسے بھیڑ بکریوں کی آوازیں سنائی دیتیں۔ کبھی کبھی کوئی جلتا ہوا الاؤ کسی تنگ کے نیچے نظر آ جاتا لیکن یہ سب گرجن دیوتا کے کرشمے تھے، وہ رات بھر طوفان میں گھرا رہا، اور

جب دوسرے دن وہ گھر پہنچا تو لوگوں نے دیکھا کہ اس کی ایک آنکھ کی بینائی جاتی رہی تھی اور اس کے پاؤں کے انگوٹھے ہمیشہ کے لئے نیلے ہو گئے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ شدّت سے ریمی سے محبت کرتا رہا۔

''پھر کیا ہوا؟'' ایک چرواہی نے کانپتے ہوئے پوچھا۔

بس گرجن کی کہانیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ ان میں محبت ہوتی ہے۔ بچپن کے ہوائے قلعے معصوم توہمات اور قدرت کے ہیبت ناک مناظر۔ ان کہانیوں میں نہ فن کاری ہوتی ہے۔ نہ عروج، نہ پلاٹ، گڈریا جو جی میں آئے کہتا چلا جا رہا ہے۔ کہانی آپ ہی آپ بنتی جا رہی ہے۔ جیسے ریشم کے کیڑے کے منہ سے ایک خوبصورت کویا تیار ہو جاتا ہے۔ اس طرح کہانی کہنے والے کی زبان کہتی چلی جا رہی ہے اور کہانی تیار ہوتی جا رہی ہے۔ یہ کہانی کہنے اس کہنے والے نے بھی پہلے کبھی نہیں سنی۔ اسے خود نہیں معلوم ''پھر کیا ہوا'' وہ کہانی کہتا چلا جا رہا ہے اور رات کے سناٹے میں الاؤ کی روشنی میں، اُون بنتی ہوئی چرواہوں کے جھرمٹ میں واٹو اور ریمی کے حسین پتلے تخیل کے شبستان میں اجاگر ہو رہے ہیں۔

لیکن ریوا کو شاعری سے دلچسپی نہیں۔ وہ کہانیاں سننا نہیں چاہتا۔ اسے اعتراض ہے کہ کیوں ہم نے پہاڑ کی بلندیوں کو چھوڑ کر یہ پستی اختیار کی ہے۔ اس کی شاہین کی سی نگاہیں شکار کی تلاش میں

زیادہ خوشی محسوس کرتی ہیں۔ اسے یہاں کی پتلیوں یا الغوزے بجاتے ہوئے گڈریوں۔ یا گرجن دیوتا کی بہیمانہ حرکتوں سے ذرا بھی دلچسپی نہیں، وہ قدرت سے طوفان سے، موت سے ایک بہادر سپاہی کی طرح مقابلہ کرنا جانتا ہے۔ اسے معلوم نہیں کہ اوشا کی بے وفائی نے میرے دل میں کیا آگ لگا رکھی ہے۔ اور اب گرجن کی برفانی وادیوں میں ایک نئے الاؤ کے شعلے لپکنے لگے ہیں۔ وہ صرف ایک خوشبو کی تعریف کرنا جانتا ہے۔ جب وہ کبھی رونسے کی زخمی کر کے فوراً اس کے نافے پر زور سے ہاتھ رکھ دیتا ہے۔ نافے کی تھیلی میں خوشبو کی لپٹیں بنکر نکل رہی ہے۔ ریوا اپنے شکار پر جھکا ہوا ہے۔ نافے کو مضبوطی سے پکڑ کر اور اسے چاقو سے چیر کر جسم سے الگ کر ڈالتا ہے۔ کہتے ہیں اگر نافے ہرن کا شکار کرتے ہوئے فوراً ہی اس تھیلی کو نہ پکڑ لیا جائے تو سارا نافہ ہرن کے جسم کے اندر ہی جذب ہو جاتا ہے۔ اور تھیلی میں ذرا سی بھی خوشبو نہیں رہتی۔ اور نافہ نافہ نہیں رہتا، بلکہ محض چربی کی ایک پوٹ۔ ریوا صرف نافے کی تعریف کر سکتا ہے۔ پنیر کی سوندھی خوشبو سے اسے گھن آتی ہے۔ ذی شی کے بالوں، ذی شی کے کپڑوں اور ذی شی کے جسم میں بھی یہی پنیر کی سوندھی خوشبو سے اسے گھن آتی ہے۔ ذی شی کے بالوں۔ ذی شی کے کپڑوں اور ذی شی کے جسم میں بھی یہی پنیر کی سوندھی خوشبو رچی

ہوئی ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکتا کہ جگدیش ایک صاحب ہو کر بھی کیونکر ذی شی سے عشق کر سکتا ہے۔ خود جگدیش کو بھی اس نئے جذبے پر حیرانی سی تھی۔ اس نے اکثر بلکہ ہم دونوں نے اکثر.... پہاڑی عورتوں سے عشق کیا تھا اور یہ عشق ہمیشہ روپوں، چند حفاظتی تدبیروں اور دو ایک ریشمی رومالوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ کبھی ہم اسے شعری جذبہ کہتے تھے کبھی وقتی شادی لیکن ہوتا یہی کچھ تھا۔ یعنی ٹک دیکھ لیا۔ دلشاد کیا، لیکن یہ کس بلا خیز طوفان کی آمد تھی کہ ذی شی کو دیکھتے ہی جگدیش اس میں ایسا کھو جاتا تھا کہ سوائے ذی شی کے اسے دنیا کی کوئی اور چیز اچھی نہ لگتی تھی۔ یہاں نہ جہیز کا سوال تھا۔ نہ تعلیم کا، نہ آداب کا اور ذی شی ان سب باتوں سے بیگانہ تھی۔ پھر بھی جگدیش اس بے وقوفی پر تلا ہوا تھا۔ وہ ذی شی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ شادی۔! سمجھتے ہو دوست۔؟ جگدیش اس بے باک پہاڑی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ جس نے صوفے کی شکل تک نہ دیکھی تھی۔ جس کے باپ کے پاس ایک گز زمین بھی نہ تھی جس کی انگلیوں میں چاندی کی انگوٹھی بھی نہ تھی۔ جس کے اطوار وحشی پرندے کی طرح تھے۔ گرجن دیوتا اس سے زیادہ بددعا اور کسی کو نہ دے سکتے تھے۔ لیکن جگدیش بے بس تھا۔ میں اسے کئی بار سمجھاتا، پاگل ہوتے ہو؟ گرجن کی زندگی خانہ بدوش گڈریوں کی زندگی ہے۔ لیکن انسان ایسی قبائلی زندگی سے

بہت آگے نکل گیا ہے۔ وہ تنگ کے درختوں تلے نہیں رہتا۔ بلکہ شہر بسا کر رہتا ہے وہ صرف مکھن اور پنیر پر قناعت نہیں کرتا۔ بلکہ زندگی کی صد ہا لذّتیں اسے میسّر ہیں۔ ذی شی پہاڑی ملک ہے۔ میدانوں میں تمازتِ آفتاب سے فوراً جھلس جائے گی تم خود اس سے نفرت کرنے لگو گے۔ کیا سمجھتے ہو؟ جس نظام میں تم رہتے ہو۔ اس میں اس قسم کی عورت ایک دن بھی بمشکل گذار سکے گی۔ گھٹ کر مر جائے گی۔ شہری زندگی کا آسمان بہت تنگ ہوتا ہے۔ اور زمین بھی نپی تُلی ہوئی وہاں نہ برفانی چوٹیاں ہوتی ہیں۔ نہ سرسبز، مرغزار ذی شی تو ایک عجائب گھر میں رکھے جانے کے لائق ہے۔ نہ کہ تمہاری بیوی ہونے کے لائق۔ اور پھر آج کل شادی میں محبت کو کیا دخل قبائلی زندگی میں محبت ہو سکتی تھی۔ لیکن موجودہ زندگی میں اور اس کے زمینی نظام میں محبت کو کیا دخل۔ اس دنیا میں ایک اونٹ کو سوئی کے ناکے سے گذارا جا سکتا ہے لیکن محبت کے جذبے کو اس دنیا میں کیا داخل نہیں کیا جا سکتا؟ جب گرجن سے واپس جاؤ گے اس وقت میری باتوں کی قدر معلوم ہو گی۔ اس وقت تمہیں اوشا یاد آئے گی۔ ذی شی تو سینما بھی تو نہیں دیکھ سکتی۔ کیا بچوں کی سی باتیں کرتے ہو؟ جگ ہنسائی ہو گی۔ لوگ کہیں گے جگدیش چڑیا گھر سے ایک جانور پکڑ لایا ہے۔ لیکن جگدیش بے بس تھا۔ شاید عمر میں پہلی بار اسے کسی سے

محبت ہوئی تھی۔ وہ محبت جو چند روپوں چند حفاظتی تدبیروں اور دو
ایک ریشمی رومالوں پر مشتمل نہ تھی۔ یہ کسی انوکھی آگ کا شعلہ تھا۔ جو
اس کی روح کے ہر کونے میں کوندتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ یہ کسی کے بس
کا روگ نہ تھا۔ اب جگدیش اور ذی شی اکثر اکٹھے رہتے تھے۔ پہلے
پہل ذی شی ہم تینوں کے ساتھ شکار کے لئے جاتی تھی۔ اس نے
بندوق چلانا بہت جلد سیکھ لیا تھا۔ اور کچھ دنوں سے تو وہ ایک مشاق
شکاری بن گئی تھی۔ جس کی نگاہیں رویا کی عقابی آنکھوں سے تیزی
میں کچھ ہی کم تھیں۔ لیکن اب جگدیش اور ذی شی اکثر اکیلے شکار کو
جاتے تھے۔ اور ریوا اور میں اکثر مخالف سمت میں جایا کرتے۔ لیکن
کبھی کبھی کسی گھاٹی کی تنگنائے میں ہمارا میل ہو جاتا۔ وہ باہوں میں
باہیں ڈالے چلے آ رہے ہوتے۔ ان کے کاندھوں پر بندوقیں
ہوتیں۔ جھولوں میں دن بھر کا شکار نگاہوں میں ایک دوسرے کے
لئے بے اندازہ محبت کبھی کبھی میں انہیں دن ڈھلے کسی گھاٹی کی اونچی
چٹان پر کھڑے دیکھ لیتا۔ ان کی پشت میری طرف ہوتی۔ جگدیش کا
ہاتھ ذی شی کی کمر میں ہوتا اور ذی شی کا سر جگدیش کے کندھے پر،
بندوقوں کی سیانالیں درختوں کے تنوں کی طرح نظر آتیں۔ جس سے
وہ سہارا لئے کھڑے ہوتے۔ وہ نیچے ان وادیوں کی طرف تک رہے
ہوتے۔ جہاں شام کی دھند پھیلتی جا رہی تھی۔ اور سورج کا پگھلا ہوا

سونا دھند کی سفید لہروں پر تیرتا ہوا نظر آتا۔ ساری فضا میں خاموشی ہوتی اور اس روپہلی خاموشی میں صرف دو دل دھڑک رہے ہوتے۔ میں ان دلوں کا گیت سن سکتا تھا۔ یکا یک ریوا بندوق سیدھی کرتا اور ''ٹھائیں'' کی آواز کے ساتھ ایک سہنولہ زمین پر آ گرتا۔ جگدیش اور ذی شی چونک جاتے جیسے ان کے سنہرے سپنے کے تار تھرّا اٹھے ہوں۔ بندوق کی گرج گھاٹیوں میں بار بار گونجتی ہوئی پھیلتی جاتی جیسے گرجن دیوتا گرج رہے ہوں۔

جگدیش بے بس تھا۔ لیکن یہ جانتا ضرور تھا کہ یہ محبت میدانوں میں پنپنے کی نہیں وہ اس سندر سپنے کو ابدی بنانا چاہتا تھا۔ لیکن سپنے آخر سپنے ہوتے ہیں۔ ان کی اپنی فضا ہوتی ہے۔ ان کی اپنی دنیا ہوتی ہے اور جب یہ ہماری دنیا سے ٹکراتے ہیں تو پانی کے بلبلے کی طرح چیخ کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور آواز بھی نہیں آتی۔ کئی لوگ اس دنیا میں سندر سپنوں کو ابدی بنانا چاہتے ہیں سچی محبت، سچی انسانیت، سچی اخوت، سچی مساوات....... پانی کے بلبلے.......وہ اس دنیا کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ نہیں جانتے کہ یہ چیزیں اس دنیا کی فضا میں نہیں پھول پھل سکتیں۔ ان کے لئے ایک نئی فضا کی ضرورت ہے۔ ان کے لئے ہمیں اس ساری دنیا کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دینا ہوگا۔ اور ایک نئی دنیا آباد کرنا ہوگی۔ جگدیش جانتا

تھا کہ یہ کہنا آسان ہے۔ لیکن کرنا بہت مشکل۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جگدیش نے واقعی اپنے سندر سپنے کو ابدی کر لیا ہے۔ مجھے وہ طوفانی رات نہیں بھولتی۔ جب اسی تنگ کے درخت کے نیچے میں، ریوا اور بوڑھا بونا رات بھر جگدیش اور ذی شی کا انتظار کرتے رہے تھے۔ برفانی ہواؤں کے فراٹوں نے ریوڑ کو اس طرح اکٹھا کر دیا تھا کہ وہ سب غریب جانور ایک دوسرے کی تھوتھنیوں میں منہ چھپائے پڑے تھے اور کراہ رہے تھے۔ تنگ کے باہر طوفان گرج رہا تھا اور بجلی کے پر پیچ حلقے زمین پر آگ کے بگولوں کی طرح چلتے نظر آتے۔ ایک جہنمی منظر تھا۔ جس میں بادلوں کی گرج، ہوا کی وحشیانہ چیخیں اور چوٹیوں پر سے گرتی ہوئی برف کے بھیانک قہقہے سنائی دیتے تھے۔ ریوا نے صبح سویرے ہی آنے والے طوفان کے متعلق ہم سب کو متنبہ کر دیا تھا۔ لیکن جگدیش اور ذی شی نے ہنس کر بات ٹال دی تھی۔ ذی شی تو طوفان سے مطلق نہ ڈرتی تھی۔ اور اس کے علاوہ اس دن وہ کسی رونسے کا شکار کرنا چاہتی تھی۔ رونسے گرجن پہاڑ کی چوٹیوں پر گھوم رہے تھے۔ جگدیش اور ذی شی دونوں رخصتِ سفر باندھ کر شکار کے لئے صبح ہی ان خطرناک بلندیوں کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ جہاں پہلے ہمارا کیمپ تھا اور میں نے اور ریوا نے انہیں رومال ہلا ہلا کر

الوداع کہی تھی۔

یہ آخری الوداع تھی۔ اس رات گرجن کے خوفناک دیوتا نے اپنے محبوب کو اپنی یخ بستہ چھاتی سے ہمیشہ کے لئے لپٹا لیا اور اپنے رقیب کے سینے میں وہی بجلی گھونپ دی جو رات بھر آگ کے پر پیچ حلقوں میں گردش کرتی رہی تھی۔ یہ گرجن دیوتا کا انتقام تھا! دوسرے دن جب ہم چند اور گڈریوں کو ساتھ لیکر انہیں ڈھونڈنے کے لئے نکلے تو ہم نے انہیں پہاڑ کی بلندیوں پر ایک سلوٹ کے نیچے مردہ اور یخ بستہ پایا۔ جگدیش کی آنکھیں کھلی تھیں اور ذی شی کی آنکھیں بھی کھلی تھیں اور وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے دیکھتے مر گئے تھے۔ ذی شی برف پر لیٹی ہوئی اور جگدیش اس کا سر اپنے زانو پر رکھے تھا۔ اور سلوٹ کے کناروں سے رات بھر پانی رستا رہا اور اس نے ان دونوں کے گرد ایک نیلم کی قبر بنادی تھی۔ ذی شی کی آنکھیں گہری نیلی تھیں۔ جیسے نندن سر کی جھیل اور جگدیش کی آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ ان کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے جگدیش کی آنکھوں کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھا۔ آہ! اِن گہرائیوں کا الم کسی بے کس زخمی، سسکتے ہوئے آہو کی فریادوں کا آئینہ دار تھا۔ ہرن جانکنی میں تھا اور زندگی نافے میں سے پھوٹ کر نکل رہی تھی۔ جب سندر سپنے اس دنیا سے ٹکراتے ہیں تو پانی کے بلبلے

کی طرح چیخ کر ٹوٹ جاتے ہیں۔

تنگ کے دائرے سے باہر گھپ اندھیرا تھا۔ الاؤ کے تنگ ہالے میں ریوڑ سویا ہوا نظر آتا تھا۔ چرواہیاں تکلی پھراتی ہوئی ان سے کچھ بن رہی تھیں۔ چرواہے محویت کے عالم میں ہاتھوں میں ٹھوڑیاں لئے ایک کہانی سن رہے تھے۔ کہانی سنانے والا چرواہا کہہ رہا تھا۔ ''بہت دن گذرے اس تنگ کے درخت کے نیچے ایک پہاڑی بونا رہتا تھا۔ اس کی لڑکی بہت خوبصورت تھی۔ اس کا نام تھا۔ ذی شی گر جن دیوتا کی منظورِ نظر تھی۔ ایک دن کیا ہوا کہ اسی تنگ کے درخت کے سائے میں تین شکاری آ کر بیٹھے۔

ایک چرواہی نے سانس روک پوچھا۔ ''پھر کیا ہوا؟''

بالکونی

میں جس ہوٹل میں رہتا تھا اسے فردوس کہتے تھے، یہ ایک سہ منزلہ مکان تھا اور چیل کی لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ دور سے ہوٹل کے بجائے کوئی پرانا جہاز معلوم ہوتا تھا۔ میرا کمرہ درمیانی منزل کے غربی کونے پر تھا۔ اور اس کی بالکونی میں سے گلمرگ کا گاف کورس، نیڈوز ہوٹل، اور دیودار کے درختوں میں گھرے ہوئے بنگلے، اور ان کے پرے کھلن مرگ کا اونچا میدان اور اس سے بھی پرے الپتھر کی چوٹی صاف نظر آتی تھی۔ گلمرگ کی شفق مجھے بہت پسند ہے اور یہاں سے تو شفق کا منظر بہت بھلا معلوم ہوتا تھا، اس لئے بھی میں نے اس کمرے میں رہنا پسند کیا۔ بہت سے لوگ جو یونہی بے سوچے سمجھے کمرے کرایہ پر لے لیتے تھے، بعد میں میری بالکونی کی طرف بہ اندازِ حسرت دیکھتے اور اکثر مجھ سے اجازت طلب کرکے میری بالکونی میں غروب آفتاب کا نظارہ کرنے آیا کرتے، اس طرح ملاقات بہت سے ایسے لوگوں سے ہوگئی، جن کا میں ابھی اس خط میں

ذکر کرونگا۔ ان لوگوں میں بینکر بھی تھے۔ اور تاجر بھی، ٹھیکیدار بھی تھے
اور پانچ بچوں والی مائیں بھی۔ طالبِ علم بھی تھے اور طالب دیدار
بھی، طرح طرح کے لوگ، مرہٹے، ایرانی، اینگلو انڈین، ڈوگرے،
پنجابی، دہلوی، مختلف زبانیں مختلف لباس، عجیب عجیب باتیں،
نوکھے تبسم، نرالے قہقہے، کائنات کی ساری ہی بوالعجبیاں اس بالکونی
میں اکٹھی ہوگئی تھیں اور یہ سب عجیب لوگ غروب آفتاب کا منظر
یکھنا پسند کرتے تھے۔ یہ بڑے غیر رومانی لوگ تھے۔ ان کی زندگی کا
صب العین روپیہ تھا، لیکن یہ لوگ اکثر حالتوں میں دو ہزار میل چل
کر گلمرگ کی شفق دیکھنے آئے تھے۔ مشینی دور میں ہر انسان روپیہ
چاہتا ہے۔ سرمایہ داری نے اس کی زندگی کو تلخ اس کے دل کو کمینہ،
اس کی روح کو غلیظ بنا دیا ہے۔ لیکن خوبصورتی کی حس ابھی مٹی نہیں،
وہ انسان کی کائنات کے کسی گوشے میں کسی زخمی رگ کی طرح ابھی
تک تڑپ رہی ہے، نہیں تو شفق دیکھنے کے لئے اس قدر بے قراری
کیوں؟ وہ لوگ شام کو شفق دیکھتے تھے۔ اور میں ان کے چہروں کو
دیکھتا تھا۔ وہی چہرے جوان ہیں پژمردہ، بھوکے اور خوفزدہ سے نظر
آتے تھے۔ اس وقت کسی انجان، ان دیکھے نور کی تابانی سے چمکتے
ہوئے معلوم ہوتے تھے، ان کے چہروں کی خباثت، اور آنکھوں کی
مجرمانہ کیفیت، اک عجیب، پرسکون، سحر طرازِ مسرت میں تبدیل

ہوجاتی تھی، وہ اس شفق کو ایسی گزشتہ نگاہوں سے دیکھتے جیسے بچے
تصور میں اپنی پریوں کی شہزادی کے محل کو دیکھتے ہیں، اور وہ عورت جو
پانچ بچوں کی ماں تھی اور جس کے چہرے پر اس کے خاوند کی ظالمانہ
بھوک نے جھائیاں پیدا کر دی تھیں۔ اپنے لٹے ہوئے حسن کو دوبارہ
حاصل کر لیتی تھی۔ اور اس وقت اس کے ادھ کھلے ہونٹوں کی چمک
اور رخساروں کی پھبن اسے واقعی کسی پرستان کی ملکہ بنا دیتی تھی۔ یہ
امر کس قدر مسرّت زا ہے، کہ انسان کے دل میں ابھی تک وہ
اضطراری شعلہ تڑھتا ہے، اس کے دل کا شاعر اس کے تصور کا بچہ اس
کے پرستان کی بلکہ ابھی تک زندہ ہے، اور جب تک وہ زندہ ہے
انسان بھی زندہ ہے۔ سرمایہ داری، ظالم سماج، ملوکیت پرستی،
فسطائیت دنیا کا ظالم سے ظالم نظام بھی اسے مٹا نہیں سکتا۔ میں
انسان کے مستقبل سے ناامید ہوں۔

فردوس امیر سیاحوں کی نظر میں ایک گھٹیا، سستا سا ہوٹل تھا۔
لیکن میرے لئے پھر بھی مہنگا تھا۔

لیکن کیا کرتا کسی ہندوستانی ہوٹل میں جگہ خالہ نہ تھی، ناچار
یہاں آنا پڑا۔ فردوس میں جو لوگ اقامت پذیر تھے ان میں آدھے
سے زیادہ مغربی تھے۔ اور باقی ایشیائی، بیرے ایک عجیب قسم کی زبان
بولتے تھے، جو نہ انگریزی تھی نہ ہندوستانی، بلکہ دونوں کے ناجائز

تعلق سے پیدا ہوئی تھی۔ کھانا چھری کانٹوں کے ساتھ کھایا جاتا تھا۔ لیکن اکثر چھُریاں کند ملتیں، اور کانٹے غیر ملمّع شدہ، اور شوربے میں ہندوستانی کھانے کی طرح سرخ مرچوں کی اتنی بھرمار ہوتی کہ بیچاری لنکاشائیر کی رہنے والی آیاؤں اور نرسوں کی زبان جلنے لگتی، اور وہ ہوٹل کے بیرے کو ایسی صلواتیں سناتیں کہ وہ خوشی سے اپنی چھاتی کا ابھار اور بھی بڑھا لیتا، بیرے کی مسّرت کا راز یہ ہے کہ اسے جتنی گالیاں ملیں وہ اتنا ہی خوش رہتا ہے۔ اور بیرہ جتنا بڑا ہو اسے اتنی ہی بڑی گالی چاہئے۔ ورنہ وہ ناخوش رہے گا اور دو ایک دن کے بعد اُداس ہو کر ہوٹل سے چلا جائے گا۔ گالی اور بخشش بیرے کی زندگی کے محور ہیں۔ کبھی اسے پہلے گالی ملتی ہے اور پھر بخشش، کبھی پہلے بخشش بعد میں گالی۔ ہر حالت میں وہ خوش رہتا ہے۔ اور انگریزی سیاست کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے، کہ وہ اپنے بیروں سے ہندوستانی قوم کا اندازہ کرتے ہیں۔ وہ پوری ہندوستانی قوم سے اپنے بیروں کا سا سلوک کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہندوستانی بھی ان سے ان کے بیروں کی طرح خوش رہیں اب ان ہندوستانیوں کی کور ذوقی کا کیا کیا جائے، کہ وہ کسی حالت میں بھی مطمئن نظر نہیں آتے۔ نہ وہ گالی پسند کرتے ہیں نہ بخشش۔

ہوٹل کا منیجر ایک مسلمان کشمیری تھا۔ نام تھا احد جو، دُبلا پتلا

کشمیری بی۔اے پاس، لبوں پر نا امیدی کی راکھ، آنکھوں میں ان تمام خوابوں کی حسرت جو پورے نہ ہوئے، چالیس روپے تنخواہ، ہوٹل کا مالک علی جو بڑھئی تھا جس نے یہ ہوٹل بڑی محنت سے جنگل سے لکڑی چرا چرا کر بنایا تھا۔ خود چور تھا اس لئے اپنے ہوٹل کے منیجر کو بھی چور سمجھتا تھا۔ ہر روز بلا ناغہ فردوس کے حساب کتاب کی پڑتال کرتا۔ دودھ مکھن اور شہد اپنے ہاتھ سے تقسیم کرتا۔ لیکن اس پر بھی اس کی تسلی نہ ہوتی۔ مزید نگرانی کے لئے اس نے ایک سکھ نوجوان کو بھی ملازم رکھ لیا۔ اور اب پاکستان اور خالصتان ایک دوسرے کے قریب رہتے ہوئے ایک دوسرے سے خائف ہونے لگے، نگرانی سے ایمان میں خود بخود فرق پیدا ہونے لگا۔ سیدھی باتوں میں فریب نظر آنے لگا۔ دل خود بخود بد دیانتی کی طرف مائل ہونے لگا۔ ہر وقت، ہر طرف سے شکوک و شبہات کا طوفان اُمڈتا ہوا دکھائی دینے لگا۔ آنکھوں کی خوبصورتی اور معصومیت زائل ہو گئی۔ اب آنکھیں کنکھیوں سے دیکھنے کی عادی ہو گئی۔ دل اپنے غصّے کو اور اپنے دشمن کو قتل کر دینے کی جائز تمنّا کو ایک جھوٹے غیر فطری تبسّم میں چھپانے لگا۔ ہوتے ہوتے یہ نگہداشت اس حد تک بڑھ گئی کہ منیجر اور مخبر سائے کی طرح ایک دوسرے کا پیچھا کرنے لگے۔ اور ہوٹل کا سارا انتظام بڑے بیرے کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ ہندوستان کی تاریخ فردوس

بھی اپنے آپ کو دوہرا رہی تھی۔

بڑا بیرہ ہر وقت مسکراتا رہتا تھا۔ خاص کر بخشش کے وقت تو اس کی عجیب حالت ہوتی تھی۔ اس وقت مجھے وہ وزن ناپنے والی جھری دار مشین یاد آجاتی۔ ادھر جھری میں ایک آنہ ڈالا اِدھر کھٹ سے ٹکٹ برآمد۔ جس پر وزن لکھا ہوتا تھا۔ بس یہی حالت بڑے بیرے کی تھی۔ اُدھر آپ نے بخشش اس کے ہاتھ میں تھمائی۔ ادھر کھٹ سے بتیسی حاضر، مجھے اس مسکراہٹ سے ایک گونہ عشق ہو گیا تھا۔ واللہ کس سرعت سے وہ بتیسی کھلتی تھی۔ بجلی کی سی تیزی سے وہ وزن ناپنے والی مشین بھی تو اتنی جلدی کام نہ کرتی تھی۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مشین آدمی سے زیادہ تیز رفتار ہے انہیں فردوس کے بڑے بیرے کو دیکھنا چاہئے۔

فردوس کے بڑے بہشتی کا نام عبداللہ تھا۔ عبداللہ ایک اجڈ کشمیری کسان تھا۔ بدصورت، بے ڈھنگی چال۔ آنکھوں کے گرد بڑے بڑے حلقے، سرخ، رخساروں پر نیلی دریدیں باہر ابھری ہوئیں۔ سامنے کے دانت غائب، عمر بھی کوئی ساٹھ سال سے اوپر ہی ہوگی، عبداللہ کا ایک لڑکا تھا۔ باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیم سا معلوم ہوتا تھا۔ عمر گیارہ بارہ برس، ہاتھ اور پاؤں سخت میلے، گھٹنوں تک اونچا پائجامہ۔ قمیص کی باہیں پھٹی ہوئیں۔ ہاں آنکھیں کنول کی

طرح روشن تھیں۔ بڑی بڑی آنکھیں اور معصوم چہرہ۔ بال بڑھے ہوئے اور پریشان، اور گردن پر میل کی تہیں۔ اک معصوم روح جو غریبی کے کیچڑ میں دھنسی ہوئی تھی اور باہر نہ نکل سکتی تھی اور مدد کے لئے چلا رہی تھی۔ اسے سب لوگ جھوٹا بہشتی کہتے تھے۔ عبداللہ اپنے بیٹے کو پیار سے غریب کہا کرتا تھا۔ عجیب نام ہے غریب یہ نام سنکر میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ غریبی دنیا کا سب سے بڑا گناہ ہے۔ اور دنیا کے کسی باپ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے بیٹے کو غریب کہے، لیکن شاید عبداللہ ایک حقیقت بیان کر رہا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو ''میرا راجہ بیٹا'' کہہ کر اپنے آپ کو اور دنیا کو دھوکا نہ دینا چاہتا تھا۔

ہوٹل میں ایک اور بہشتی بھی تھا۔ یوسف۔ شکل سے کنجڑا دکھائی دیتا تھا۔ بڑا بددماغ بہشتی تھا۔ ہر روز پٹتا پھر بھی گالی کے بغیر کام نہ کرتا۔ اس کے علاوہ، وہ چرس کا دم بھی لگاتا تھا اور عورتوں کی دلالی بھی کرتا تھا۔ یوسف چھوٹے بیرے کا بڑا دوست تھا۔ چھوٹا بیرہ ایک متین قسم کا انسان تھا۔ بیحد خدمت گذار ''جی'' کے سوائے اس کے منہ سے کبھی کوئی اور کلمہ نہیں سنا۔ لب ولہجہ میں روغن قاز اس قدر گھلا ہوا تھا کہ آدمی کے بجائے بناسپتی گھی کا ڈبہ معلوم ہوتا تھا۔ اس قدر بھی خوشامد کیا کہ ہر وقت ہاتھ جوڑ رہے ہیں۔ مرے جا رہے ہیں گفتار و اطوار میں اسقدر تملّق اور چاپلوسی پیدا کر رہے ہیں جو ہر

شریف انسان کے لئے بے حد شرمناک ہے۔ میں نے ایسا نرم گفتار، خوشامدی پرفن انسان اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ یہ بھی عورتوں کا دلال تھا۔ لیکن صرف انگریز عورتوں یا اینگلو انڈین چھوکریوں کی دلالی کرتا تھا۔ کبھی کبھار کسی ہندوستانی فلم ایکٹریس کا کام بھی کر دیتا۔ اس کا نام تھا۔ کیا نام تھا۔ بھلا سا نام تھا۔ ذہن میں پھر رہا ہے۔ زبان پر نہیں آ رہا ہے۔ ہاں زماں خاں، زماں خاں! یہ نام میں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ ممکن ہے تمہارے دل میں کبھی اس قسم کی خواہش پھر جاگ اٹھے اور تم فردوس میں جا اترو۔ ہاں تو زماں خاں کا نام نہ بھولنا۔ ایک ہی حرامی ہے اس فردوس میں۔

اس جہاز نما ہوٹل کا حدود اربعہ نامکمل رہ جائیگا اگر میں یہاں کے ایک مستقل باشندے کا ذکر نہ کروں یہ ایک آرٹش بڈھا تھا۔ اور پچھلے دس سال سے گلمرگ کے اسی ہوٹل میں مقیم تھا۔ ملگجی داڑھی، آئین سٹائن کا سا سر، وہی الجھے ہوئے بال وہی فراخ ماتھا۔ ہاں ہونٹوں اور ناک کی تراش یہودیوں کی سی نہ تھا۔ ناک کے دائیں نتھنے پر ایک چھوٹا سا مسّا تھا، جو اس کے چہرے کی فراست کو اور بھی نمایاں کر دیتا تھا۔ اس کی آنکھوں کے رنگ کا میں کبھی ٹھیک طور سے اندازہ نہ کر سکا۔ کبھی تو وہ آسمان کی پہنائیوں کی طرح نیلی معلوم ہوتیں۔ اور کبھی کسی پرانی ٹھہری ہوئی جھیل کی گہرائیوں کی طرح سبز

دکھائی دینے لگتیں۔ اور پھر اس کے چہرے پر کسی نا معلوم سے
دھندلکے کا غبار ہر وقت چھایا رہتا۔ اس لطیف دھند کی طرح ہلکا سا
جو اکثر میرے کمرے میں گلمرگ کے بادلوں سے چھٹ کر بھاگتی
ہوئی آ جایا کرتی۔ اوبرائن کا چہرہ (بڈھے کو سب ہی اوبرائن کہتے
ہیں) کبھی تو اس غبار میں بالکل روپوش ہو جاتا اور کبھی یہ غبار اس قدر
لطیف ہو جاتا کہ اس کے دھندلے خدوخال کے نیچے اس
کی زندگی کا استہزائیہ انداز صاف صاف عیاں ہو جاتا۔ اوبرائن
خوب پیتا تھا اور ہمیشہ بڑھیا شراب پیتا تھا۔ اور جب مخمور ہوتا تو بہت
عمدہ باتیں کرتا تھا۔ شگفتہ انداز، سلجھے ہوئے فلسفیانہ فقرے، طنزیہ
بیان، جن میں ایک انفرادی تجربے کی ساری گہرائی پنہاں ہوتی، وہ
کبھی تو گھنٹوں باتیں کرتا اور کبھی گھنٹوں چپ رہتا۔ اسے نہ شکار کا
شوق تھا نہ عورتوں کا، اور عجیب بات یہ ہے کہ گوشت بھی نہ کھاتا تھا۔
ہاں پنیر سے اسے بہت رغبت تھی۔ کہتا تھا کہ پنیر کے ایک ٹکڑے پر
میں دس دن زندہ رہ سکتا ہوں، تم ابھی بچے ہو۔ جب میری عمر کو پہنچو
گے تو معلوم ہو گا کہ عورت کے شباب میں بھی وہ تازگی نہیں ہے جو
اس پنیر کے ٹکڑے میں اور اس بادۂ ناب کے ایک قطرے میں، پیو،
پیو، اور پیو اور اس گلمرگ کی شفق کو دیکھو، جس کے ابلتے ہوئے خون
میں اس وقت مغربی افق کا حسن دو چند ہو گیا ہے...... اوبرائن

فردوس کا فلسفی ہے۔ اگر کبھی گلمرگ جاؤ تو اس سے ضرور ملنا، وہ زندگی کے ان حقائق کو بیان کرتا ہے جنہیں اس نے اپنی حیات کے زخموں سے نچوڑا ہے۔ اس کا بیان ایک تلخاب ہے اک رستا ہوا زخم ہے، اک خوفناک زہر کا دھارا ہے۔ لیکن اس زہراب کی لہروں پر ایک ایسے ہلاکت آفریں تبسم کا سایہ ہے کہ تم اس سے مسحور ہوئے بغیر نہ رہ سکو گے..... اور اگر سچ پوچھو تو ابھی تک زندگی میں اس کے سوا اور ہے بھی کیا؟

عبداللہ کے بیٹے کو لکھنے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ اُردو کا قاعدہ ختم کر چکا تھا، اور اب اُردو کی پہلی کتاب پڑھ رہا تھا۔ جس کے پہلے صفحہ پر اس کا باپ حقّہ پی رہا تھا۔ عبداللہ کو جب بھی فرصت ملتی وہ اپنی کوٹھری میں جا کر حقّہ پیتا، یا کبھی کبھار جب مجھے فرصت ملتی تو بالکونی میں آن بیٹھتا۔ اس کا بیٹا مجھ سے سبق لیا کرتا، اور عبداللہ اپنی زندگی کی رام کہانی سناتا، یہ کہانی اس نے ٹکڑوں میں، قاشوں میں، آنسوؤں اور مسکراہٹوں کے درمیان، نہانے کے ٹب کے پاس کھڑے ہو کر، کھانستے ہوئے، دمے کے عارضے سے جنگ کرتے ہوئے سنائی تھی۔ یہ کوئی بڑی رومانی داستان نہ تھی، کوئی بری المناک داستان نہ تھی، ایک سیدھے سادھے دہقان کی زندگی تھی۔ چند خوشیاں تھیں، اور اَن گنت آنسو۔ وہ ایک کسان تھا۔ چند بیگھے زمین

تھی۔ جوانی میں اس نے محبت بھی کی تھی، شادی بھی کی، چند سال بہت بھلے معلوم ہوئے، زندگی کا رقص سہانا تھا۔ صعوبتیں آئیں۔ لیکن شباب کے تازہ خون نے انہیں دھو دیا۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد اس نے گاؤں کے مہاجن کا قرضہ چکایا۔ اور کھیتوں کی پیداوار بڑھانے کے لئے مختلف طریقے سوچنے لگا۔ اپنے کھیتوں کا ایک حصہ اس نے پھلدار درختوں کی کاشت کے لئے الگ کر دیا۔ دل میں امنگیں تھیں چاہتا تھا کہ وہ معمولی کسان نہ رہے۔ دیہات کا ایک متمول زمیندار بن جائے امارت حاصل کرنے کے لئے اس نے مہاجن سے قرضہ لیا۔ لیکن متواتر دو سال برف و باراں کا یہ عالم رہا کہ باغ پنپ نہ سکا، پھر قحط پڑا، زمین بک گئی، بڑا لڑکا مر گیا، بیوی بھی اسی قحط کی نذر ہوئی۔ وہ اپنے چھوٹے اور آخری بچے کو اپنی چھاتی سے لگائے دیس بدیس گھوما، رخساروں کا رنگ لٹ گیا، آنکھوں کی چمک غائب ہو گئی دو کانوں پر کوئلہ اٹھاتے اٹھاتے دمے کی بیماری ہو گئی، اب کھانسی ہوتی ہے گلے میں بلغم پھنس جاتا ہے، گلا رندھ جاتا ہے۔ آنکھیں پھٹی پڑتی ہیں۔ پانچ چھ سال اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد اپنے وطن واپس آیا۔ کیونکہ وطن کی مٹی ہر بھٹکی ہوئی روح کو ہر وقت واپس بلاتی رہتی ہے۔ اب چھ سال سے وہ اسی ہوٹل میں نوکر ہے غنیمت ہے یہ زندگی، اللہ کا شکر ہے صاحب، دو وقت روٹی مل جاتی

ہے، صاحب انعام بھی دیتے ہیں۔ یہ میرا یتیم بچہ ہے، غریب، خدا اس کی عمر دراز کرے، یہاں اسی طرح پڑا رہیگا، تو بہشتی کے سوا اور کیا بن سکے گا۔ دو چار حرف پڑھ جائیگا تو زندگی سنور جائیگی۔ خدا آپ کو اس کا اجر دے۔ میرے غریب کو سبق بتایئے۔ اچھا میں اب چلتا ہوں۔ ولیم صاحب کے نہانے کے لئے پانی رکھ آؤں۔"

افوہ کس قدر بے حیا ہے یہ خدائی، کیسی معمولی سی زندگی ہے، اب کن توقعات پہ آدمی جیئے۔ ہزاروں، لاکھو، کروڑوں آدمیوں کی یہی زندگی ہے۔ ہر ملک میں ہر قوم میں کرۂ ارض کے ہر حصے میں، چند ایک افراد اور جماعتوں کو چھوڑ کر ہم سب کو اپنی تہذیب پر، اپنے مذہب پر اپنے کلچر پر، اپنی سوجھ بوجھ پر اپنی فراست پر ناز ہے، یہ ہیکڑی یہ رعب، یہ ملمع سازی!...... انسان کے جھوٹ اور خود فریبی کی کوئی حد نہیں ہے۔ اور عبداللہ کو دیکھئے کہ ناخوش ہے، کھانس رہا ہے، پھر بھی جیئے جا رہا ہے، اس امید پر کہ اگر دنیا نے اسے پنپنے کا موقع نہیں دیا، اگر سماج کے قہر نے اس کی زندگی کی ساری راحتوں اور مسرتوں کو اس کی آنکھوں کے سامنے گلا گھونٹ کر اسے یوں ترسا ترسا کر مار ڈالا تو اب یہی سماج، یہی دنیا، یہی نظامِ حیات، اس کے بیٹے کو پنپنے کا موقع دیگا، لیکن عبداللہ آخر انسان ہے۔ کشمکشِ حیات اس کی گھٹی میں ہے، لڑے جاتا ہے مرے جاتا ہے۔ شاباش بیٹا،

لڑے جا، مرے جا، ایک دن تیرا بیٹا جوان ہوگا، اس کی لہکتی ہوئی امنگوں کی کامرانی میں تو پھر زندہ و جاوید ہوگا۔ اس کے شباب کی تازگی میں اس کے حسن و عشق کی رنگین داستانوں میں اس کے جذبہء مسرّت کی سربلندیوں میں تیری روح اپنے آپ کو پالے گی۔

بالکونی کے ملاقاتیوں میں سے ایک خوش شکل جوڑے کی یاد اب بھی دل میں باقی ہے، دونوں نوجوان تھے، خوبصورت اور پڑھے لکھے نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ اسی لئے گل مرگ میں ہنی مون منانے آئے تھے۔ اسی لئے گل مرگ دیکھنے کے بجائے ایک دوسرے کو دیکھنے میں زیادہ مصروف رہتے تھے، لڑکا لڑکی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتا۔ "جانِ من یہ شفق کس قدر خوبصورت ہے۔" اور لڑکی اپنا نرم ہاتھ اس کے کندھے سے چھو کر کہتی، "اور یہ پھولوں سے مہکی ہوئی فضا، ہائے میں تو مر جاؤں گی......" بس یہ دونوں دن بھر مرتے رہتے تھے۔ شفق پر مر رہے ہیں۔ پھولوں پر مر رہے ہیں، گاف کورس پر مر رہے ہیں، چاندنی پر مر رہے ہیں، دیودار کے درختوں سے لیکر پہاڑی ٹٹوؤں پر مر رہے ہیں۔ بعد میں یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ دونوں دن بھر تو مرتے رہتے ہیں اور رات بھر جاگتے رہے ہیں، اتفاق سے ان کا کمرہ میرے کمرے کی چھت پر تھا۔ تیسری منزل پر، بس رات کو کبھی گلاس ٹوٹنے کی آواز آتی تھی، کبھی چارپائی

اوندھی ہو جاتی کبھی بلّیاں غرّاتی تھیں۔ اوبرائن کا خیال تھا کہ دونوں ایک خواب دیکھ رہے ہیں اور نہیں جانتے کہ اس الف لیلوی خواب کی حد پر حقیقت کا آسیب بھی رہتا ہے۔

میں نے کہا۔ ''بڈھے تیری عقل ماری گئی ہے کیا شادی کرنا برا ہے شادی ہوتی ہے، بچے پیدا ہوتے ہیں۔ اس خواب سے انسانوں کی سہانی بستی میں ایک نئے گھر کا اضافہ ہوتا ہے۔

اوبرائن کہتا، ''شادی بری نہیں، خواب کا ٹوٹنا برا ہوتا ہے۔ اور یہ سپنے بہت جلد ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔ قدرت اپنے دام بچھاتی ہے۔ اسی لئے تو اس نے پھولوں میں خوشبو، ہرن میں کستوری اور عورتوں میں رعنائی رکھی، اور جب قدرت کا مقصد پورا ہو جاتا ہے تو پھول مرجھا جاتے ہیں، ہرن شکار ہو جاتے ہیں، عورتیں بوڑھی ہو جاتی ہیں، اور تمہارے سپنے ٹوٹ جاتے ہیں۔''

''جس طرح رات کو میرے ہاتھ سے شیشے کا گلاس ٹوٹ گیا تھا۔'' لڑکی نے مسکرا کر کہا۔ اور کنکھیوں سے اپنے محبوب کو دیکھنے لگی۔ دونوں نے کسی ایسے دلچسپ واقعے کو اپنی نگاہوں میں دہرایا، جس کی حیثیت اس وقت قندِ مکرر کی سی ہو گئی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ''پھر کیا ہوا؟''

وہ دونوں ہنسنے لگے، لڑکی بولی، ''رات کا وقت تھا، گلاس ٹوٹ

گیا اور پانی فرش پر بہہ نکلا۔ فرش لکڑی کا تھا اور نیچے آپ کا کمرہ تھا۔"
میں نے کہا۔"وہ تو یوں سمجھئے خیریت ہوئی، میرا بستر ذرا ایک طرف تھا..... ہاں کمرے کی دری ابھی تک گیلی ہے۔"
"آہ..! ڈارلنگ، دیکھو وہ چڑیا کتنی خوش انگ ہے۔" لڑکی نے مجھے ٹوٹے ہوئے گلاس کی طرح بے کار سمجھ کر اپنے شوہر سے کہا۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ دباتے ہوئے بالکونی سے باہر دیکھنے لگے۔
اوبرائن بولا۔"حسن ابدی نہیں ہے۔ بس مجھے کائنات اور اس کے بنانے والے پر رہ رہ کر یہی غصہ آتا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟"
میں نے کہا۔"کون کہتا ہے ابدی نہیں ہے، تم حسن کو انفرادی حیثیت سے دیکھتے ہو۔ سخت رجعت پسند ہو تم۔ حسن کو اجتماعی حیثیت سے دیکھو، پھول ہمیشہ مسکراتے ہیں نافے میں کستوری سدا مہکتی ہے۔ عورتوں کی رعنائی......" میں نے نوجوان لڑکی کی طرف دیکھ کر فقرہ ناتمام رہنے دیا۔ اوبرائن کی آنکھیں گہری سبز ہو گئیں۔
"اور پھر غور کرو۔ کہ حسن وقت کا ایک حصہ ہے۔ اس کا جمالیاتی تاثر ہے، جب تک وقت نہیں مرتا حسن کیسے مر سکتا ہے۔ عورت اپنی لڑکی میں پھول اپنی کلی میں ہرن اپنے نافے میں اس حسن کو فروزاں دیکھتا ہے۔"

"اور عبداللہ اپنے بیٹے میں۔" اوبرائن نے طنز سے کہا۔

ہم بہت عرصہ چپ رہے، لڑکا اور لڑکی چلے گئے۔ پھر بھی خاموشی رہی، بیرے نے چائے رکھ دی، ہم دونوں خاموشی سے اسے پینے لگے۔ پہاڑوں پر دھند گہری ہو گئی تھی۔ گاف کورس پر بدلیوں کے نازک نازک ہاتھ بڑھتے ہوئے نظر آئے، بالکونی تک آپہنچے، ہمارے گالوں کو چھونے لگے۔ یہ نازک نازک ہاتھ......

بس گل مرگ میں مجھے یہی چیز پسند ہے، یہ لطیف لمس، یہ دھند کی سپید انگلیاں، اپنے گاؤں کا سا منظر ہے۔ اوبرائن اپنی پرانی یادوں میں کھو گیا۔

پھر یکا یک کہنے لگا۔ "شراب کبھی بوڑھی نہیں ہوتی، بس یہی ایک چیز دنیا میں ابدی ہے..... میں نے ایک عورت سے محبت کی، اس نے مجھے ٹھکرا دیا۔ میں نے اپنی محبت کے نشے کو مدتوں تازہ رکھا۔ پھر یہ محبت بھی بوڑھی ہو گئی میں نے اسے جوان رکھنا چاہا، لیکن ہر لمحہ اس کے چہرے پر جھریاں پڑتی گئیں، ایک دن وہ بھی مر گئی۔"

"اور۔ وہ عورت۔"

"پتہ نہیں کہیں ہو گی، میں اب اسے دیکھنا نہیں چاہتا۔ میں اپنے وطن واپس جانا نہیں چاہتا۔ بیس سال پہلے میں نے اسے دیکھا تھا۔ وہ پیانو پر بیٹھی ہوئی اک دلفریب گیت بجا رہی تھی۔" اوبرائن

آہستہ آہستہ سیٹی میں وہ گیت بجانے لگا۔ اس کی آنکھیں پرنم ہوگئیں۔ باہر دھند میں وہ لڑکا لڑکی غائب ہو رہے تھے۔

فردوس کا عشق بڑا عجیب ہے، فردوس میں ہر اتوار کو ٹنگ مرگ سے نرسیں آتی تھیں، اور آیا لوگ اور ناشتہ کھلانے والی لڑکیوں کو ہر بدھوار کو چھٹی ملتی تھی۔ اس لئے فردوس میں بدھ اور اتوار کی رات کو کھانے اور پینے کے لئے خاص اہتمام ہوتا اول تو کھانا زیادہ تیار کیا جاتا، شراب زیادہ مقدار میں مہیا کی جاتی، اور پھر اسی دن گورے اور امریکن فوجی نہ جانے کہاں سے ٹپک پڑتے، بالکل بچوں کے سے چہرے ظاہری خشونت کے باوجود بھی مجھے وہ بے حد معصوم دکھائی دیتے۔ پتلونوں کی تراش، ٹوپی کے زاویئے، اور چھاتی کے پھیلاؤ کے باوجود یہ لوگ مجھے برے نہ لگتے، ان کے چہرے جیسے کچھ مانگ رہے تھے، جیسے کسی چیز کے متلاشی تھے، بھوکے تھے، پیاسے تھے، کچھ حاصل کرنا چاہتے تھے۔

یہ عشق حاصل کرنا چاہتے تھے، چنانچہ ان کی ضرورت زمان خاں جو فردوس میں عشق کا تاجر تھا۔ پوری کر دیتا۔ انداز یہ ہوتا۔

"ویل بیرا۔"

"دلیس سر۔"

"کیا باٹ ہے۔"

''سب ٹھیک ہے۔ ٹنگ مرگ سے نیا مس صاحب آیا ہے،
لیکن صاحب اس کو صبح چار بجے ٹنگ مرگ میں میجر صاحب کے بنگلے
پر حاضر ہونا مانگٹا.....''

''اوہ سب ٹھیک ہے۔ ام کھود۔ سُنا تم نے، ام کھود پہنچائے گا۔''

ایک انداز یہ ہوتا۔

''ہیلو ڈارلنگ..!'' وہ کہتا۔

''ہیلو سوائن۔'' (سور کے بچے) نرس کہتی۔

''کم آن۔''

''یُو سٹوپڈ (تم احمق ہو)

''ڈونٹ بی سلّی (جاہل نہ بنو) کم آن۔'' (اب آ بھی جاؤ)

You are very cheexy

shutup

اس خوبصورت اور حسین تعارف کے بعد دونوں دیودار کے
جنگلوں میں بنفشے کے پھول جمع کرنے کے لئے تشریف لے
جاتے۔

او برائن ان فاقہ مستوں کو معاف کر دیتا تھا۔ یہ بیچارے چند
دنوں کے لئے چھٹی پر آئے تھے۔ اس کے بعد پھر جنگ پر جائیں
گے۔ یہ فوجی ان چند دنوں میں اپنی جوانی سے سارا رس نچوڑ لینا

چاہتے تھے۔ اپنے ارمانوں کی دنیا کو بوسوں کی شہد آگیں لذّت سے ہمکنار کردینا چاہتے تھے۔ پھر اس کے بعد وہی رتیلے میدان ہوں گے، وہی خندقیں، جنگلوں میں دشمنوں کی گھات۔

''میں سپاہی کو ہمیشہ معاف کردیتا ہوں، وہ ایک عورت کی عصمت پر ہاتھ ڈالتا ہے۔ تو ہزاروں عورتوں کی عصمت بچا لیتا ہے۔'' اوبرائن کا یہ فقرہ مجھے اب تک یاد ہے۔ شاید اس وقت برما سے بھاگے ہوئے ایک ٹھیکیدار نے کہا تھا۔ ''صاحب کس کی عصمت وصمت یہ فلسفہ کھانا کھانے کے بعد سوجھتا ہے۔ اجی صاحب جب ہم برما سے بھاگے تو میرے ساتھ پورا خاندان تھا۔ بیوی تھی۔ نوجوان لڑکیاں تھیں، چھوٹے چھوٹے بچے تھے، سب راستے میں مر گئے؟ میں نے اپنی آنکھوں سے اپنے بچوں کو اپنی بیوی کو روٹی کے ایک ٹکڑے کے لئے ترستے دیکھا۔ میری لڑکیاں پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے اپنی عصمت اس خونی سڑک پر بیچتی نظر آتی تھیں؟ اُلو کا پٹھا ہے۔ حرامزادہ ہے وہ جو عصمت کی تقدیس پر ایمان رکھتا ہے۔ یہ سب فلسفہ پیٹ بھرنے کے بعد سوجھتا ہے۔''

وہ دیر تک اسی طرح بکتا جھکتا رہا۔ اوبرائن کے چہرے سے غبار چھٹنے لگا۔ کہنے لگا۔ ''شراب منگاؤ۔ شراب، بس شراب کبھی بوڑھی نہیں ہوتی، شراب کبھی نامہربان نہیں ہوتی، شراب کبھی دھوکا

نہیں دیتی، وہ انسان کی طرح ظالم نہیں ہے، خدا کی قسم، ابنِ مریم کی قسم وہ ہرگز ظالم نہیں ہے۔"

گہرے نیلے آسمان میں تارے چمکنے لگے۔ نیڈوز ہوٹل کی پہاڑی پر یکا یک بجلی کے قمقموں کی قطار روشن ہو اٹھی۔ ایسا معلوم ہوا گویا کسی نے بنفشے کے پھولوں کی چھڑی فضا میں اچھال دی اور پھر چاند مغربی افق پر شفق کی آخری لکیر پر محجوب، شرمایا ہوا برآمد ہوا۔ اس مہ وش ساقی کی طرح جس نے اپنے دستِ سیمیں میں پہلی بار مینا اٹھائی ہو۔

او برائن پینے لگا۔ اب اس کی آنکھیں نیلی تھیں۔ آسمان کی طرح صاف۔

☆☆☆☆☆

کمرہ نمبر سات میں ایک اطالوی بڈھا اور اس کی لڑکی میریا رہتے تھے۔ میریا دن بھر اپنے کمرے میں پیانو بجاتی رہتی اور شام کو اپنے باپ کے ساتھ سیر کرنے جایا کرتی۔ میریا کے خدوخال میں ایشیائی مناسبت تھی۔ شاید اسی لئے میں اسے اس قدر پسند کرتا تھا۔ بڈھا اطالوی یہاں پچیس تیس سال سے رہتا تھا۔ بازار میں اس کی ایک دوکان تھی۔ جہاں وہ سامانِ خوردونوش رکھتا تھا۔ کتابوں کی ایک

چھوٹی سی لائبریری بھی تھی۔ جس میں زیادہ تر جاسوسی ناول فحش قصے، بھوتوں کی کہانیاں اور اسی قسم کا ادب تھا۔ جو سپاہیوں کو اور پڑھے لکھے اُمراء کو بے حد مرغوب ہے، وہ اس کی لائبریری سے کتابیں کرائے پر پڑھنے کے لئے جاتے، بڈھے اطالوی کو چھڑی بنانے کا بہت شوق تھا۔ اور وہ جنگل کی لکڑیوں سے ایسی خوبصورت چھڑیاں بناتا تھا۔ جو گل مرگ کی سوغات میں شمار ہوتی تھیں۔ اور سیاح انہیں خرید کر بڑے شوق سے اپنے وطن لے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ اسے (Concetina) بجانے کا بہت شوقت تھا۔ رات کو وہ کھانا کھا کر (Concetina) کے ساتھ گایا کرتا اور میریا پیانو بجاتی۔ میریا پیانو بہت اچھا بجاتی تھی۔ اور جنگ سے پہلے گل مرگ میں اکثر معزز انگریز خاندانوں میں پیانوں سکھانے جایا کرتی۔ جنگ شروع ہوتے ہی یہ دونوں باپ بیٹی حراست میں لے لئے گئے بعد میں جب انہوں نے اپنے ہندوستانی باشندے ہونے کا ثبوت مبہم پہنچایا تو چھوڑ دیے گئے۔ پھر بھی ان پر کڑی نگرانی تھی۔ جنگ سے پہلے بڈھے کی دوکان کا نام تھا "اطالوی سٹور" جنگ شروع ہوتے ہی اس نے یہ نام بدل کر "اینٹی اطالوی سٹور" کر دیا، حراست کے بعد اس سٹور کا نام "اتحادی سٹور" ہو گیا، دراصل اس بڈھے کو سیاست سے متلق دلچسپی نہ تھی۔ میرا خیال ہے کہ اگر کل گرمرگ پر جنگل کے ریچھوں

کی حکومت ہو جائے تو یہی اطالوی بڈھا اپنی دوکان کا نام بدل کر
''ریچھ سٹور'' رکھ دیگا، اور ساتھ ہی جلی حروف میں یہ الفاظ بھی۔
''یہاں ریچھوں کو شہد مفت ملتا ہے!'' لیکن فی الحال تو اس
حکومت کے قیام کا کوئی گمان نہ تھا۔ جنگ شروع ہو جانے کے بعد
میریا کا انگریزی خاندانوں میں آنا جانا بند ہو گیا تھا۔ اور پیانو
سکھانے سے جو آمدنی ہوتی تھی وہ بھی ختم ہو چکی تھی۔ اُدھر اطالوی
یعنی اینٹی اطالوی یعنی اتحادی سٹور کی آمدنی بھی کم ہو گئی تھی۔ اس
لئے حالت ذرا پتلی تھی۔ فردوس کے چھوٹے بیرے زمان خان نے
یہ سب حالات دیکھکر میریا پر اپنا دام پھینکا تھا لیکن میریا قابو میں نہ
آئی۔ بعض غریب لوگ بیحد ڈھیٹ ہوتے ہیں۔ بڑی مشکل سے
قابو میں آتے ہیں۔ میریا کا شمار انہی بڑی مشکلوں میں ہوتا تھا۔
زمان خاں اس کی وجہ سے بے حد پریشان تھا، ہوٹل کے بڑے بہشتی
عبداللہ کو اسی وجہ سے میریا اور اس کے باپ سے ہمدردی تھی۔ کیونکہ
وہ خود ایک لُٹا ہوا کسان تھا۔ سینے میں ایک زخمی دل رکھتا تھا۔ اسی وجہ
سے اس کی لڑائی زماں خاں اور چھوٹے بہشتی سے ہوئی، جو کمرہ نمبر
سات کا کام دلجمعی سے نہ کرتے تھے، اور زماں خاں تو کمرہ نمبر سات
کا کام کرنے کے بجائے لڑکی کو الٹا پریشان کرتا تھا۔ عبداللہ لڑائی میں
بری طرح پیٹا گیا۔ ہاتھ پاؤں پر چوٹیں بھی آئیں اور منیجر نے الٹا

ڈانٹا۔ کیونکہ کمرہ نمبر سات کی دیکھ بھال زماں خاں اور یوسف کے سپرد تھی۔ عبداللہ کو دخل در معقولات کا کیا حق تھا۔ اب کے اس نے اپنی ہمدردی یوں ظاہر کی تو نوکری سے الگ کر دیا جائے گا۔

میریا مجھے پسند تھی۔ اس کا حُسنِ صبیح، کنول کی طرح کھلا ہوا چہرہ۔ آنکھوں کی خطرناک معصومیت، جسم کے نازک خم، ہونٹوں کا وہ اُجلا اُجلا تبسم۔ لیکن میریا کی متانت مجھے بہت ناگوار معلوم ہوتی تھی۔ میں چاہتا تھا۔ کہ یہ لڑکی متین نہ رہے ان معصوم آنکھوں میں شوخی جھلکنے لگے۔ اس کنول کی پتیوں پر ہنسی کی تیتری رقصاں ہو جائے اس اجلے تبسم میں شرارت کی تجلی تڑپ جائے، اس کے سارے رگ و پے میں اک ایسی تھرتھری آئے کہ اس کی ہستی کا گوشہ گوشہ بیدار ہو جائے اور اس کی حیات کا بہاؤ کسی طوفانی ندی کی طرح اُمڈتا ہوا نظر آئے۔

......میریا......میریا.....ایک دن پیانو پر Nuteracker کی دھن بجا رہی تھی، مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے کہا، ”یا تو تم نری احمق ہو، بے وقوف ہو، جاہل ہو یا.....“

”یا۔؟......ہاں کہو۔“

”یا تم عورت کے بھیس میں راسیوٹین ہو Nuteracker کی دھن سنکر مجھ ایسے کور مغز ایشیائی کی جی بھی ناچنے کو چاہتا ہے، اور

ایک تم ہو کہ بجھے ہوئے بلب کی طرح بالکل ٹھس بیٹھی ہو۔ کیا بات ہے آخر؟ اٹھو بھاگو، دوڑو ناچو، ناچو، ناچو حتیٰ کہ تمہاری کائنات کا ذرّہ ذرّہ متحرک ہو جائے اور تمہارے جسم کا ایک ایک خم تھک کر چور ہو جائے۔'' یہ کہہ کر میں نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر پیانو پر سے اٹھا لیا۔ اور دو تین چکر کمرے میں تیزی سے ناچتے ہوئے لگائے، پھر یکا یک ٹھہر گیا، اب وہ میرے بازوؤں کے حلقے میں تھی۔ میں نے اس کے ہونٹ چومتے ہوئے کہا۔ ''اس جنگ کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟''

اس نے اپنے آپ کو میرے بازوؤں کی گرفت سے آزاد کر لیا۔ اور میرے منہ پر ایک ہلکا سا طمانچہ مار کر بولی۔ ''تم بڑے وحشی ہو جی۔''

میں نے کہا۔ ''میں یہی غصہ دیکھنا چاہتا تھا، مجھے تمہاری اس متین مسکراہٹ سے سخت چڑ ہے، تمہارے انداز اطالوی لڑکیوں جیسے نہیں ہیں۔ وہ مجنونانہ جوش و خروش وہ بے موقع ہنسی، اُچھل کود، وہ.....وہ سب کچھ تم میں نہیں ہے۔ واللہ تم عورت نہیں ہو۔ مرمر کا بُت ہو اور یا تو تم اپنی زیست پر دانستہ اس بھاری متانت کا دبیز پردہ ڈالے ہوئے ہو، تاکہ لوگ تم سے مرعوب ہو جائیں۔ یوراسپوٹین گرل......ادھر آؤ، میرے پاس بیٹھو۔''

وہ کہنے لگی۔ "جب تم میری عمر کو پہنچو گے تو تمہیں معلو ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "میں تم سے عمر میں دس سال بڑا ہوں۔"

میریا بولی۔ "میری مراد ذہنی عمر سے تھی۔ اصل عمر وہی ہوتی ہے۔ یوں تو شاید تم مجھ سے عمر میں دس سال بڑے ہو گے لیکن تمہارا ذہن، تمہارے فہم تمہارا ادراک بالکل مرغی کے ایک چھوٹے چوزے کی طرح ہے۔"

"اچھا تو گویا میں ایک چوزہ ہوں۔" میں نے غصے سے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

"ایک ناپختہ چوزہ۔!" یہ کہہ کر وہ مسکرائی، وہی متین، غم آلود مسکراہٹ۔

میں نے پوچھا، "اس جنگ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔"

وہ کہنے لگی، "جنگ..... جنگ.... تمہارا بوسہ بہت اچھا تھا۔ .... جنگ بہت بری شے ہے، میں ایک عورت ہوں۔ میں آدمی کے بوسے کو سمجھ سکتی ہوں۔ اس کے قاتلانہ جذبے کو نہیں سمجھ سکتی، یہ کشت و خون کیوں ہوتا ہے۔ میرا بھائی اس وقت فوجی قیدی ہے۔" اس کی آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔

میں نے کہا، ''معاف کرنا۔ یہ جنگ تمہارے فسطائیوں نے شروع کی ہے۔''

وہ بولی، ''میں فسطائی نہیں ہوں۔ نہ ہی میرا بھائی تھا۔ میرا باپ چھریاں بناتا ہے۔ اور رات کو Concertina پر گانا پسند کرتا ہے۔ مجھے پیانو سے عشق ہے۔ میں نے کبھی سیاست کے متعلق نہیں سوچا، ہمیشہ آزاد اور لاتعلق سی رہی اسی لئے مجھے فسطائیت پسند نہیں جب میں پیدا ہوئی تو عہد نامہ ورسائی پر دستخط ہو چکے تھے اور میں ہندوستان میں تھی۔ مجھے مسولینی سے کوئی ہمدردی نہیں۔ اس نے تو میرا پیانو سکھانا بھی بند کر دیا۔''

اس کی آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔ میں نے کہا، ''تم کسی پولیس آفیسر کے سامنے بیان نہیں دے رہی ہو۔''

وہ بولی۔ ''مجھ سے تو سب ہی پولیس آفیسروں کا سا برتاؤ کرتے ہیں۔ میرے لئے یہ نئی بات نہیں ہے۔ لیکن دراصل یہ ہماری غلطی تھی، ہم خوشی کے راگ الاپتے رہے Concertina بجاتے رہے، اور سیاست سے بے بہرہ رہے اور ہم نے فسطائیوں کے من مانی کارروائی کرنے کا موقع دیا'' اس کی سانس رکنے لگی۔

میں نے اس کی ٹھوڑی چھوکر کہا۔ ''اچھا چلو جانے دو..... یہ آخری جنگ نہیں ہے، اگر ہم لوگ پچیس تیس برس اور زندہ رہے،

لوگ اور جنگ دیکھیں گے اس سے کہیں زیادہ بھیانک اور خوفناک جنگ، یہ جنگ فسطائیوں کو تو شاید تباہ کر دے لیکن مشرق و مغرب کے نازک مسائل کو نہ سلجھا سکے گی۔ نہ یہ دنیا اس اشتر کی نظام کی بنیاد رکھ سکے گی جس کے بغیر بھوک، بے کاری اور جہالت کا اس کرۂ ارض سے دور ہونا ناممکن ہے۔ اس لئے آؤ، بے تہوون Moonlight Sonte شروع کرو۔ تا کہ اس زندگی کی حرماں نصیبی اور اپنے محبوب آورش کی دوری کا احساس زائل ہو جائے....."

میریا نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور پیانو بجانے لگی۔

☆☆☆☆☆

چاندنی رات تھی میں اور او برائن کھانے کے بعد بالکونی میں بیٹھے ہوئے اپنے تخیل میں پرستانی قلعے تعمیر کر رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ الپتھر کی جھیل کے وسط میں برف کے گلیشروں کے درمیان ایک خوبصورت محل ہو، اور اس میں میریا ہو اور ایک بہت بڑا پیانو۔ چاندی کا اور میریا کا لباس سیب کے پھولوں کا ہو.....اور میریا ہو۔ اور میں.....اور بس اور کوئی نہیں.....الو کہیں کا۔ لوگ بھوکے مر رہے ہیں۔ کہ اک چاندی کے پیانو، جھیل کے وسط میں ایک محل ہو، یہ ہو، وہ ہو......بس ہمیشہ یہی مصیبت ہوتی ہے۔ ایسے خوبصورت سپنے

اسی طرح جلد ٹوٹ جاتے ہیں۔ لیکن آدمی ایسے خواب کیوں دیکھتا ہے، آدمی سے مراد کیا چیز ہے، عبداللہ بھی تو آدمی ہے، عبداللہ نے بھی کبھی ایسے خواب دیکھے تھے۔ اب بھی اپنے بیٹے کے لئے شب و روز ایسے ہی سپنے دیکھتا ہے۔ انسان کو یہ سپنوں کی دنیا کیوں پیاری ہے۔ اور کیوں وہ ان سپنوں کو حقیقت نہیں بنالیتا، سورج، پانی، چاند، ہوا کی طرح اگر زمین اور اس کی ساری پیداوار بھی سب انسانوں میں مشترک ہو جائے تو ہر گھر ان سندر سپنوں کا جگمگاتا ہوا شیش محل بن جائے، پھر انسان ایسا کیوں نہیں کرتا۔ وہ کیوں غاصب ہے اشترا کی کیوں نہیں، کیا اس میں اتنی سی عقل بھی نہیں کہ اس سیدھی سادی بات کو سمجھ لے......

اوبرائن سگار کی راکھ جھاڑ کر بولا، ''ہنری فورڈ کا لڑکا مر گیا ہے۔''

میں نے پوچھا، ''پھر؟ اس سے موٹروں کا کاروبار پر کیا اثر پڑیگا۔ شہتوت کے درختوں پر پھل لگنے بند ہو جائیں گے کیا؟''

اوبرائن بولا، ''نہیں دراصل غور کر رہا تھا کہ وہ ہنری فورڈ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ہنری فورڈ امریکہ میں سرمایہ داری کا مظہر ہے.....اب میں سوچتا ہوں، سرمایہ دار ہنری فورڈ خوش ہے؟ خوش تھا، خوش رہے گا؟ آخر یہ دولت کے انبار کیوں؟ ان کا مصرف ہی کیا

ہے۔ جبکہ ہنری فورڈ دو بسکٹ اور آدھ پاؤ دودھ بھی دن میں ہضم نہیں کر سکتا۔"

میں نے کہا، "ہنری فورڈ بہت بڑا آدمی ہے وہ اس قدر محنت کرتا ہے کہ کچھ کھا نہیں سکتا۔"

اوبرائن بولا، "ماؤنٹ ایوریسٹ بھی بہت بڑا پہاڑ ہے۔ بڑائی دونوں پر ہے۔ ہنری فورڈ میں بھی۔ لیکن ہنری فورڈ کی عظمت غیر فطری ہے۔ مصنوعی ہے، اس کی حیثیت غاصبانہ ہے۔ ماؤنٹ ایوریسٹ کی دلکشی اک معصوم بچے کی سی ہے جو سپید برف سے کھیل رہا ہو۔ وہ ابدی ہے۔"

میں نے پوچھا، "گاندھی کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔"

اوبرائن بولا، "ایک مدّت تک مجھے کالے آدمیوں سے نفرت رہی اب بھی کبھی یہ نفرت جاگ اٹھتی ہے۔ مجھے ان کا رنگ پسند نہیں، ان کا احساسِ کمتری پسند نہیں، ان کا خوشامدانہ لہجہ پسند نہیں، میرا خیال رہا ہے کہ اِن میں بلی کی سی چالاکی اور لومڑی کی سی دھوکے بازی پائی جاتی ہے۔ اور حبشیوں کو تو میں مدّتوں انسان سمجھنے سے انکار کرتا رہا..... گاندھی کالا آدمی ہے۔ وہ کبھی سفید آدمی کا دوست نہیں ہو سکتا۔ بعض لوگ اسے یسوع مسیح کی طرح معصوم سمجھتے ہیں۔ میں اس دھوکے میں مبتلا نہیں ہوں۔ میرا اب بھی یہی خیال

ہے کہ سفید نسل کے انسانوں کا جانی دشمن ہے۔"

میں نے کہا، "وہ تو صرف یہ چاہتا ہے کہ ہندوستان میں ہی ہندوستانیوں کی حکومت ہو۔" اوبرائن بالکونی پر جھک گیا۔ بولا، "ممکن ہے میر جذبات عصبیت سے خالی نہ ہوں، آخر میں بھی سفید نسل سے تعلق رکھتا ہوں۔ لیکن اس وقت اس نے ہمیں سخت مشکل میں ڈال دیا ہے۔

ہندوستان بھر میں اک آگ سی پھیلی ہوئی ہے۔ اور یہ بدامنی ہمیں جاپانیوں کا مقابلہ کرنے سے روک رہی ہے۔"

عین اس وقت زور سے بگل بجنے کی آواز آئی، اور بہت سے گھوڑوں کی چاپ، انگریز گھڑ سواروں کا ایک قافلہ ہماری بالکونی کے نیچے سے گزر رہا تھا۔ یہ لوگ پستولوں اور رائیفلوں سے مسلح تھے۔ آگے آگے دو انگریز بگل بجا رہے تھے۔

یہ قافلہ بالکونی کے نیچے سے گزرتا ہوا گاف کورس کی طرف چلا گیا۔

میں نے کہا، "بداعتمادی سے بداعتمادی پیدا ہوئی ہے۔ یہ زندگی کا اصول ہے۔ انگریزوں کو ہندوستانیوں کی جمہوریت پسندی پر اعتماد نہیں۔ اور ہندوستانیوں کو انگریزوں کی ہمدردی اور دادرسی پر، اب دیکھئے، یہاں گلمرگ میں کوئی سائیں نہیں لیکن یہاں بھی یہ لوگ

بلاناغہ رات کو گشت کرتے ہیں اور ایک بنگلے سے دوسرے بنگلے تک گھومتے ہوئے سارے گلمرگ کا چکر لگاتے ہیں۔ مبادا کہیں کوئی کانگریسی بم پھینک دے۔"

سرکلر روڈ کی سمت سے وہ نوجوان جوڑا چلا آرہا تھا۔ چاندنی میں شرابور دل آسودہ، امنگوں سے لبریز۔ نچلی منزل میں مس جائس جولنکا شائیر کی رہنے والی تھی، نہایت اداس سُروں میں اپنے وطن کا ایک دیہاتی گیت گارہی تھی۔ اس کا نیا یار شرابی لہجہ میں بار بار کہہ رہا تھا، "ڈارلنگ میں بھی لنکا شائر کا رہنے والا ہوں۔ ڈارلنگ میں بھی لنکا شائر کا رہنے والا ہوں۔"

چاندنی میں نہائے ہوئے بت سیمیں کو اپنی آغوش میں لئے نوجوان لڑکا سڑک پر کھڑا ہو کر وہیں اپنی بیوی کو چومنے لگا۔

نچلی منزل پر یکا یک نرس رونے لگی۔ "میں گھر جانا چاہتی ہوں۔ ڈارلنگ بوائے میں گھر جانا چاہتی ہوں۔"

اوبرائن کہنے لگا۔ "انسان ابھی جغرافیائی عشق سے آزاد نہیں ہوا۔ گاندھی ہندوستانی ہے۔ اسے ہندوستان سے عشق ہے۔ یہ نرس لنکا شائر کی رہنے والی ہے اسے لنکا شائر سے عشق ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ گل مرگ کے مقابلہ میں لنکا شائر بالکل...." وہ سر ہلا کر چپ ہو گیا۔

میں نے کہا۔ ''پرسوں بلّی مل کی دوکان پر میری ملاقات ایک انگریز دروزن سے ہوئی۔ وہ انگلستان کی لیبر پارٹی کی ممبر تھی۔ وہ بھی تمہاری طرح گاندھی کو برا بھلا کہہ رہی تھی، کہتی تھی کہ اب گلمرگ میں بھی فساد ہوگا، اور یہی لوگ جو آج ہمارے پاس شہد، ڈبل روٹی اور شلغم بیچنے کے لئے آتے ہیں ہم پر چھروں اور لاٹھیوں سے حملہ کرینگے پھر وہ مسکرا کر کہنے لگی بہتر یہ ہے کہ میں ان لوگوں کے ہاتھوں ماری جاؤں جو مجھے جانتے ہیں۔ مجھے اجنبیوں کے ہاتھوں مرنا پسند نہیں۔''

اوبرائن بولا۔ ''تم نے اس طنز کا ملاحظہ کیا؟''

میں نے کہا۔ ''یہ طنز سراسر غلط تھا۔ گاندھی کسی انگریز کو قتل کرنا نہیں چاہتا اور پھر اس انگریز دروزن کو جو لیبر پارٹی کی ممبر بھی تھی۔ ہندوستانیوں سے اس قدر خوف کیوں محسوس ہو رہا تھا۔ یہ اتنی بد اعتمادی کس لئے۔ تمہارے خیال میں کیا اس میں رتی بھر احساسِ گناہ شامل نہ تھا؟''

نیچے، نرس اب زور زور سے چلا رہی تھی۔ ''میں لنکا شائر جانا چاہتی ہوں سلّی بوائے۔ میں لنکا شائر جانا چاہتی ہوں، سلّی بوائے.....''

اوبرائن مسکرا کر کہنے لگا... ''اور یہی گاندھی چاہتا ہے۔''